دارالاشاعت الاسلامیہ لاہور

کا مقصد

عُلومِ قرآنی کی عُمومی نشرواشاعت

ہے : تاکہ

① عوام کی توجہات قرآن حکیم کی جانب مُنعطف ہوں، ذہنوں پر اُس کی عظمت کا نقش قائم ہو، دلوں میں اُس کی محبت جاگزیں ہو ——— اور اس کی جانب ایک عام التفات پیدا ہو جائے۔

② بہت سے ذہین اور اعلیٰ صلاحیتیں رکھنے والے نوجوان بھی اس سے متعارف ہوں اور اُن میں سے کچھ تعداد ایسے نوجوانوں کی بھی نکل آئے جو اس کی قدر و قیمت سے اس درجہ آگاہ ہو جائیں کہ پوری زندگی اس کے علم و حکمت کی تحصیل اور نشر و اشاعت کیلئے وقف کر دیں۔

تاکہ

ایک عظیم الشان قرآن اکیڈمی کے قیام

کی راہ ہموار ہو سکے!

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ

اسرار احمد بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تذکرہ و تبصرہ

گزشتہ ماہ ہم نے عرض کیا تھا، کہ ملت اسلامیہ پاکستان میں اس وقت دو نمایاں طور پر مختلف بلکہ متضاد نقطہ ہائے نظر اور طریقہ ہائے فکر پائے جاتے ہیں جن میں سے ایک علی گڑھ کا معنوی تسلسل ہے اور دوسرا دیوبند کا۔[1]

یوں تو ایک عظیم ملت میں فکر و نظر کے صدہا رنگوں (SHADES) کا پایا جانا ایک فطری اور قدرتی امر ہے، چنانچہ ہماری قوم میں بھی سوچنے کے لاتعداد انداز اور غور و فکر کے بے شمار طور طریقے پائے جاتے ہیں۔ تاہم ذرا دقتِ نظر سے دیکھا جائے تو صاف نظر آجاتا ہے کہ فکر و نظر کے ان لاتعداد رنگوں میں اصل اور پختہ رنگ دو ہی ہیں۔ ایک علی گڑھ کا اور دوسرا دیوبند کا۔ بقیہ تمام رنگ جو ان کے مابین یا ان کے اردگرد پائے جاتے ہیں سب ان کے امتزاج ہی سے وجود میں آتے ہیں اور ان میں سے کسی میں علی گڑھ کا رنگ زیادہ نمایاں ہے اور کسی میں دیوبند کا ——— گویا کہ جیسے کہ ہم نے گزشتہ ماہ عرض کیا تھا، ہماری ملت کے بحرِ عمیق کی اصل دو رَو ہی ہیں جو تقریباً ایک سو سال سے "مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ یَلْتَقِیٰنِ" کی طرح بالکل متصل اور ملحق لیکن "بَیْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا یَبْغِیٰنِ" کی سی علیحدگی اور لاتعلقی کے ساتھ مسلسل چلی آرہی ہیں ——— ان میں سے ہر ایک کا ایک مستقل ماضی اور متعین فکری اساس ہے، اور چونکہ ان میں سے ہر ایک کی پشت پر ایک وسیع و عریض اور پختہ و محکم نظامِ تعلیم بھی موجود ہے، لہٰذا ان دونوں کے اثرات نہایت دور رس ہیں اور ان کی جڑیں ہمارے جسدِ ملی میں بہت گہری اتری ہوئی ہیں۔ گویا کہ یہ دونوں مکاتبِ فکر ہماری قومی و ملی زندگی میں "اَصْلُهَا ثَابِتٌ" کی سی محکم اساس اور "وَفَرْعُهَا فِی السَّمَآءِ" کا سا ہمہ گیر

[1] کیا اللہ کی شان ہے کہ ملت اسلامیہ پاکستان کے ان دونوں دینی و مذہبی اور تہذیبی و ثقافتی سوتوں کے اصل منبع ہندوستان ہی میں رہ گئے ——— اور یہی نہیں بلکہ جیسا کہ بعد میں واضح ہو گا، ان دونوں کے مابین امتزاج کی جتنی کوششیں ہوئیں ان سب کے اصل مراکز بھی وہیں رہ گئے۔

ر و مسلک رکھتے ہیں۔

اوپر ہم نے علی گڑھ کی 'مذہبی عقلیت' جیسے جسٹس امیر علی، سر سید احمد خاں اور مولوی چراغ علی وغیرہم نے مرتب کیا تھا اس کا تذکرہ ہم کر چکے ہیں۔ ساتھ ہی اس کے مقابلے میں دیوبند جس کی بنیاد مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے ہاتھوں پڑی اور جن کے ذریعے اس میں کتاب و سنت کا علم ہی نہیں بلکہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی روحانیت بھی سرایت کر گئی تھی جس طرح قال اللہ اور قال الرسولؐ کا حصار اور دین و مذہب کے 'نقل' کے دفاع کا مرکز بنا، اس کی تفصیل بھی ہم بیان کر چکے ہیں ـــــ اور دونوں کے 'مذہبی فکر' کے مابین جو بُعد المشرقین پایا جاتا ہے اس کا تذکرہ بھی تفصیل کے ساتھ ہو چکا ہے ـــــ لیکن اس کے بارے میں یہ گمان درست نہ ہوگا کہ یہ بُعد ہمیشہ، ہر حال اور ہر صورت میں موجود رہا۔ اس کے برعکس، واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں سے بعض ایسی شخصیتیں بھی ابھریں جو اپنے اصل مکتبِ فکر کے عمومی مزاج کی بالکل ضد ثابت ہوئیں۔ چنانچہ ع

"حسنؓ ز بصرہ، بلالؓ از حبش، صہیبؓ از روم" کے مصداق سرزمینِ علی گڑھ سے بھی بہت سے راسخ العقیدہ، ذہناً مسلم اور قلباً مومن لوگ اٹھے جن میں سے ایک مولانا محمد علی جوہر کی مثال ہی اتنی درخشاں و تابناک ہے کہ مزید کی کوئی حاجت نہیں[1]۔ دوسری طرف خاکِ دیوبند سے مولانا عبید اللہ سندھیؒ ایسی متجددانہ مزاج رکھنے والی شخصیت بھی ابھری جنہوں نے جدید دنیا کا مطالعہ ہی نہیں بھرپور مشاہدہ بھی کیا، اور جدید رجحانات کے زیرِ اثر ملتِ اسلامیہ کے لئے تمدن و معاشرت اور معیشت و سیاست کے میدانوں میں ایسی راہیں تجویز کیں جن کے لئے استناد دیوبند کے موجود الوقت متداول ماحول سے نہیں بلکہ صرف امام الہند شاہ ولی اللہ الدہلوی کے فلسفہ و افکار ہی سے مل سکتا تھا[2]! ـــــ تاہم یہ مثالیں محض استثنائی ہیں اور ایک انگریزی مثل[3] کے مطابق، ان سے

[1] خود علامہ اقبالؒ بھی جن کا تذکرہ بعد میں تفصیل سے آئے گا۔ بہرحال اصلاً اسی شاخ سے متعلق ہیں۔

[2] مولانا عبید اللہ سندھی کے واسطے سے 'حکمتِ ولی اللّٰہی' کی اس شاخ کے غالباً واحد، ورنہ کم از کم معروف ترین وارث پاکستان میں پروفیسر محمد سرور ہیں جنہوں نے متجددین کے 'امام العصر' ڈاکٹر فضل الرحمان صاحب کے 'فکر و نظر' کی ترجمانی کا منصب تا حال سنبھالے رکھا ہے ـــــ یہ دوسری بات ہے کہ اب وہ 'لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ' کہہ کر اس سے کنارہ کشی اختیار کر لیں (ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ مولانا عبد الماجد دریابادی جیسے بزرگ اور جہاندیدہ ہستی نے ڈاکٹر فضل الرحمان صاحب کی اس وکالت پر اظہارِ حیرت فرمایا ہے جو پروفیسر صاحب نے کی۔ ہمارے نزدیک تو بات بالکل صاف ہے اور اس میں حیرت و تعجب کا کوئی پہلو موجود نہیں!)

[3] "EXCEPTIONS PROVE THE RULE!"

وہ کلیہ مزید مستحکم ہوتا ہے جو ہم نے بیان کیا تھا۔ یعنی یہ کہ علی گڑھ اور دیوبند کے مابین کم از کم بُعد المشرقین موجود ہے[1]۔

اس بُعد کا احساس بھی بالکل شروع ہی سے ہو گیا تھا اور اس فاصلے کو کم کرنے اور ان دونوں کو ایک دوسرے سے قریب تر لانے کی ضرورت بھی بالکل ابتداء ہی سے محسوس کی جانے لگی تھی ـــــ چنانچہ ان کے مابین امتزاج اور ارتباط کی کوششوں کا سراغ بھی بالکل ابتداء ہی سے ملتا ہے۔ ندوۃ العلماء کا قیام ان کوششوں کا مظہرِ اول تھا ـــــ اور دہلی میں جمعیت الانصار اور جامعہ ملیہ کا قیام مظہرِ ثانی۔ پھر ان ہی کوششوں کا ایک تیسرا مرکز جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن بنا اور اس نے بھی جدید و قدیم کو قریب لانے میں ایک اہم رول ادا کیا۔

ندوہ کے بارے میں یہ بات بالکل صحیح ہے کہ وہ علی گڑھ کی کوکھ سے برآمد ہوا۔ مولانا شبلی نعمانی مرحوم جو پہلے علی گڑھ کے پروفیسر شبلی تھے اور بعد میں ندوہ کے علامہ شبلی بنے، ابتداءً سر سید مرحوم کے رفقاء اور اعوان و انصار میں سے تھے۔ جو بعد میں ان سے بدظن اور ان کی تعلیمی سکیم سے غیر مطمئن ہو کر ان سے علیحدہ ہوئے۔ ہمیں یہاں ان اسباب سے کوئی بحث نہیں جن کی بنا پر یہ علیحدگی واقع ہوئی۔ ہمیں بحث قیامِ ندوہ کے صرف اس پہلو سے ہے کہ یہ قدیم و جدید ـــــ اور تجدد و جمود کے مابین ایک متوازن علمی و فکری راہ پیدا کرنے کی سعی کا سب سے پہلا اور ہر اعتبار سے اہم ترین مظہر ہے۔

لیکن ـــــ یہ ایک واقعہ ہے کہ ندوہ فکر و نظر کا مرکز بننے کی بجائے صرف عربی زبان و ادب کا ایک گہوارہ اور تاریخ اسلامی کا ایک دارالاشاعت بن کر رہ گیا۔ اور علی گڑھ کے جدید اور دیوبند کے قدیم مذہبی فکر کے مابین کوئی حقیقی اور واقعی امتزاج پیدا کرنے میں بالکل ناکام رہا ـــــ!

ایک جدید لیکن متوازن 'علم کلام' کی تدوین کی ضرورت کا احساس تو مولانا شبلی کو شدت کے ساتھ تھا۔ چنانچہ اسی لئے پہلے انہوں نے "علم الکلام" میں قدیم علم کلام کی تاریخ مرتب کی اور پھر نیا علم کلام "الکلام" کے نام سے لکھنا شروع کیا ـــــ لیکن ایک تو وہ اس کی صرف ایک جلد لکھ کر رہ گئے حالانکہ اس

[1] یہ بُعد صرف مذہبی تصورات اور دینی فکر کے میدان تک ہی محدود نہ رہا۔ بلکہ جیسا کہ ہم مارچ، اپریل، مئی سنہ ۶۶ء کے 'میثاق' کے اداریوں میں تفصیل سے عرض کر چکے ہیں۔ اس بُعد سے ملی و قومی سیاست بھی بری طرح متاثر ہوئی اور اس میدان میں بھی ان دونوں کے رُخ بالکل متضاد سمتوں میں مڑ گئے ـــــ جس سے ملتِ اسلامیہ ہند و پاک کی سیاسی قوت کو شدید نقصان پہنچا۔

کی تکمیل ان کے پیشِ نظر اسکیم کے مطابق تین جلدوں میں ہوتی تھی[1] اور دوسرے یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ وہ وقت کے تقاضے کو بھی بالکل نہ سمجھ پائے۔ اور جو "علم کلام" اس وقت حقیقتاً مطلوب تھا اس کے فروع کیا اصول بھی ان پر واضح نہ ہو سکے!

جن دو انتہاؤں کے مابین مولانا شبلی ایک متوازن راہ نکالنا چاہتے تھے ان کا تذکرہ خود ان کے الفاظ میں سنیئے:۔

"حال ہی میں علم کلام کے متعلق مصر، شام اور ہندوستان میں متعدد کتابیں تصنیف کی گئی ہیں اور نئے علم کلام کا ایک دفتر تیار ہو گیا ہے —— لیکن یہ نیا علم کلام دو قسم کا ہے: یا تو وہی فرسودہ اور دور از کار مسائل و دلائل ہیں جو متاخرین اشاعرہ نے ایجاد کئے تھے[2] یا یہ کیا ہے کہ یورپ کے ہر قسم کے معتقدات اور خیالات کو حق کا معیار قرار دیا ہے اور پھر قرآن و حدیث کو زبردستی کھینچ تان کر ان سے ملا دیا ہے[3] —— پہلا کورانہ تقلید ہے اور دوسرا تقلیدی اجتہاد[4]......" (علم الکلام - تمہید)

ان دونوں کو رد کرکے جس تیسرے علم کلام کی ضرورت ہے اس کے ضمن میں "جدید تعلیم یافتہ گروہ" کا نقطہ نظر مولانا نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:۔

"ہر طرف سے صدائیں آرہی ہیں کہ پھر ایک نئے علم کلام کی ضرورت ہے۔ اس ضرورت کو سب نے تسلیم کر لیا ہے لیکن اصول کی نسبت اختلاف ہے۔ جدید تعلیم یافتہ گروہ کہتا ہے کہ نیا علم کلام بالکل نئے اصول پر قائم کرنا ہوگا۔ کیونکہ پہلے زمانے میں جس قسم کے اعتراضات اسلام پر کئے جاتے تھے، آج ان کی نوعیت بالکل بدل گئی ہے۔ پہلے زمانے میں یونان کے فلسفے کا مقابلہ تھا جو محض قیاسات اور مظنونات پر قائم تھا۔ آج بدیہیات اور تجربہ کا سامنا ہے اس لئے اس کے مقابلے میں محض قیاسات عقلی اور احتمال آفرینیوں سے کام نہیں چل سکتا!" (ایضاً)

لیکن کمال سادگی کے ساتھ اس رائے کو محض یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ:۔

---

[1] غالباً اس لئے کہ اس پہلی ہی جلد پر جو مخالفت ہوئی اور کفر کے فتوے موصول ہوئے، وہی مولانا شبلی کے لئے بہت کافی تھے۔

[2] یہ صاف اشارہ ہے حلقۂ دیوبند کی نئی کلامی تصنیفات کی جانب جیسے مثلاً مولانا محمد قاسم نانوتوی رح کی "حجۃ الاسلام"!

[3] مراد ہے سر سید احمد خاں اور مولوی چراغ علی کا علم کلام۔

[4] مولانا کا یہ طرز تعبیر یقیناً بہت قابل داد ہے۔

"لیکن ہمارے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں۔ قدیم علم کلام کا جو حصہ آج بے کار ہے پہلے بھی ناکافی تھا۔ اور جو حصہ اس وقت کارآمد تھا آج بھی ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ کیونکہ کسی شے کی صحت اور واقعیت زمانہ کی امتداد و انقلاب سے نہیں بدلتی۔ اس بنا پر مدت سے میرا ارادہ ہے کہ علم کلام کو قدیم اصول اور موجودہ مذاق کے موافق مرتب کیا جائے......" (ایضاً)

چنانچہ جو کچھ انہوں نے کیا وہ یہی تھا کہ قدیم علم کلام کو نئے اسلوب، نئے پیرایۂ بیان اور نئے انداز میں گویا کہ نئے "مذاق" کے مطابق پیش کر دیا۔

لیکن اصل مسئلے کے فہم کی کوتاہی میں مولانا شبلی غالباً بالکل معذور ہیں۔ اس لئے کہ ایک تو ان کے زمانے تک جدید فلسفے اور سائنس کا ارتقاء ہی نہیں ہوا تھا۔ دوسرے خود فلسفہ بھی ابھی صرف سپنسر اور مِل تک ہی پہنچا تھا۔ گویا کہ فکر جدید کا اصل چیلنج ابھی پوری طرح سامنے نہیں آیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ "الکلام" کے مقدمے میں مولانا نے فلسفہ و سائنس کی موجود الوقت صورت حال کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:۔

"تمام دنیا میں ایک غل مچ گیا ہے کہ علوم جدیدہ اور فلسفۂ جدیدہ نے مذہب کی بنیاد متزلزل کر دی ہے۔ فلسفہ و مذہب کے معرکے میں ہمیشہ اس قسم کی صدائیں بلند ہوتی رہی ہیں اور اس لحاظ سے یہ کوئی نیا واقعہ نہیں۔ لیکن آج یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ فلسفۂ قدیمہ قیاسات اور ظنیات پر مبنی تھا اس لئے وہ مذہب کا استیصال نہ کر سکا۔ برخلاف اس کے فلسفۂ جدیدہ تمامتر تجربہ اور مشاہدہ پر مبنی ہے۔ اس لئے مذہب کسی طرح اس کے مقابلے میں جانبر نہیں ہو سکتا —— یہ ایک عام صدا ہے جو یورپ سے اٹھ کر تمام دنیا میں گونج اٹھی ہے۔ لیکن ہم کو غور سے دیکھنا چاہیئے کہ اس واقعیت میں مغالطہ کا کس قدر حصہ شامل ہو گیا ہے۔

یونان میں فلسفہ ایک مجموعہ کا نام تھا جس میں طبعیات، عنصریات، فلکیات، الٰہیات، مابعد الطبعیات سب شامل تھا۔ لیکن یورپ نے نہایت صحیح اصول پر اس کے دو حصے کر دیئے جو مسائل مشاہدہ اور تجربہ کی بنا پر قطعی اور یقینی ثابت ہو گئے ان کو سائنس کا لقب دیا اور جو مسائل تجربہ و مشاہدہ کی دسترس سے باہر تھے ان کا نام فلسفہ رکھا!"

لیکن افسوس کہ یورپ میں یہ "نہایت صحیح اصول" بس تھوڑی دیر ہی چل سکا اور جلد ہی اس کے بجائے وہ "فطری

---

[1] بقول اکبر الٰہ آبادی مرحوم

غزالی و رومی کی بھلا کون سنے گا!
محفل میں چھڑا نغمۂ اسپنسر و مل ہے!

اصول، بھر بروئے کار آگیا کہ علم ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے، اور اسے سائنس اور فلسفے کے دو جداگانہ خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ یورپ کا بعد کا فلسفہ ان نظریات کی اساسات پر مرتب و مدوّن ہوا جو سائنس کے بعض شعبوں سے ابھرے، جیسے مثلاً ڈاروِن کا نظریۂ ارتقا اور فرائڈ کا نظریۂ جنس وغیرہ۔[1]

الغرض، جدید دنیا کو جو نیا علم کلام فی الواقع مطلوب تھا اس کے تو اصول و اساسات کے بارے میں بھی مولانا شبلی صحیح تصور قائم نہ کر پائے تو اس کی تدوین کیا کرتے۔ رہا دوسرے معاملات میں علی گڑھ اور دیوبند کے مابین امتزاج تو اس کی بھی کوئی صورت ندوہ میں پیدا نہ ہو سکی ——— اور مولانا شبلی کے بعد ان کے جانشین مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے جب حلقۂ دیوبند کی ایک علمی و روحانی شخصیت یعنی مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ہاتھ پر بیعت کر لی تو یہ بات کھل ہی گئی کہ ندوہ کوئی مستقل چیز ہے ہی نہیں۔ اس کی حیثیت بس ایک چھوٹی سی لہر کی ہے جو علی گڑھ کی عظیم رو سے نکل کر بالآخر دیوبند کی دوسری بڑی رَو میں جا شامل ہوئی۔ بعد میں جب سید سلیمان ندوی کے شاگردِ رشید سید ابوالحسن علی ندوی نے کچھ عرصہ اِدھر اُدھر کی خاک چھاننے کے بعد بالآخر اسی حلقۂ دیوبند کی ایک دوسری روحانی شخصیت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کے ہاتھ پر بیعت کی تو یہ اسی سنّتِ سلیمانی کا اتباع ہے۔ بہرحال اب ندوہ کی حیثیت دیوبند کے ایک ضمیمے کی ہے یا زیادہ سے زیادہ ایک توسیع (EXTENSION) کی۔ اس کا مستقل جداگانہ وجود کوئی نہیں!

اس طرح ندوہ تو بہت جلد ختم ہو گیا اور مولانا شبلی جو درمیانی راہ نکالنا چاہتے تھے وہ اس کے ذریعے سے نہ نکل سکی۔ تاہم ان کی یہ خواہش بعض دوسری پگڈنڈیوں کی صورت میں ظاہر ہوئی جن کا تذکرہ اہمیت کا حامل ہے۔ مولانا شبلی اپنی ذات میں ایک نہایت جامع الصفات انسان تھے اور ان کی شخصیت ندوہ کی نسبت بہت زیادہ جامع اور ہمہ گیر تھی۔ چنانچہ وہ بیک وقت علم و فضل، فلسفہ و کلام، شعر و ادب اور ملّی و قومی سیاست حتیٰ کہ رندی و رنگینی سب کے جامع تھے۔ ان کے اصل جانشین سید سلیمان ندوی مرحوم کی شخصیت میں مولانا شبلی

---

[1] یورپ میں جس طرح جدید سائنس اور فلسفے کا ارتقا ہوا اور جیسے ان دونوں میدانوں سے خدا کے تصوّر کو خارج از بحث کیا گیا اس کی تاریخی تفصیل کے لئے دیکھئے پروفیسر یوسف سلیم چشتی کا مقالہ "فکرِ مغرب کی اساس اور اس کا تاریخی پس منظر" شائع شدہ "میثاق" نومبر دسمبر ۶۴ء و مشمولہ کتابچہ "اسلام کی نشاۃ ثانیہ" ——— اور اس کے فلسفیانہ پس منظر کے لئے دیکھئے ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب کا مقالہ "صحیح نظام تعلیم اور پاکستان" شائع شدہ "میثاق" اکتوبر ۶۶ء۔

کی اپنی شخصیت کے صرف چند ہی پہلوؤں کا تسلسل قائم رہ سکا۔ لیکن ان کے زیرِ اثر دو اور ہستیاں ایسی پروان چڑھیں جو ان کی بعض دوسری صفات کی وارث بنیں اور جن میں مولانا شبلی کی شخصیت کے بعض دوسرے پہلو اجاگر ہوئے۔ ہماری مراد مولانا حمید الدین فراہی اور مولانا ابوالکلام آزاد سے ہے۔ یہ دونوں حضرات براہِ راست تو ندوی نہیں لیکن ان کی تربیت میں مولانا شبلی کا بڑا حصہ ہے ——— اور چونکہ برصغیر کی حالیہ مذہبی فکر کے میدان میں علی گڑھ اور دیوبند کی دو انتہاؤں کے مابین دو اہم علمی و فکری سوتے ان ہستیوں کی بدولت پھوٹے ہیں لہٰذا ان کا کسی قدر تفصیلی تذکرہ ضروری ہے۔

مولانا فراہیؒ اور مولانا آزاد مرحوم میں متعدد امور بطورِ قدرِ مشترک بھی ہیں۔ مثلاً ایک یہی کہ دونوں کی تربیت میں مولانا شبلی کا حصہ تھا۔ دوسرے یہ کہ دونوں کو قرآن حکیم سے خاص شغف تھا۔ تیسرے یہ کہ دونوں اپنے وقت کے انتہائی وضع دار انسان تھے۔ چوتھے یہ کہ دونوں (مولانا شبلی کے بالکل برعکس ——— جنہوں نے اپنی 'حنفیت' کی شدت کے اظہار کے لئے 'نعمانی' کی نسبت کو اپنے نام کا مستقل جزو بنا لیا تھا) تقلید سے یکساں بعید و بیزار تھے اور دونوں کو اصل ذہنی و علمی مناسبت امام ابن تیمیہؒ سے تھی ———

لیکن ان اشتراکات کے بعد اختلافات کا ایک وسیع میدان ہے جس میں یہ دونوں شخصیتیں ایک دوسرے کی بالکل ضد تھیں۔ مولانا آزاد میں شبلی کی رندی و رنگینی کا تسلسل بھی موجود رہا جبکہ مولانا فراہی بالکل زاہد خشک تھے۔ مولانا آزاد کی وضعداری میں شکوہ و تمکنت کی آمیزش تھی جبکہ مولانا فراہی پہ فقر و درویشی کا رنگ غالب تھا۔ مولانا آزاد "ابوالکلام" تھے اور ان کی شعلہ بیانی خطابت میں ایک لاوا اگلنے والے زندہ آتش فشاں کا رنگ تھا جبکہ مولانا فراہی نہایت کم گو تھے اور ان کا سکوت ایک ایسے خاموش آتش فشاں سے مشابہت رکھتا تھا جس کے باطن میں تو خیالات و احساسات کا لاوا جوش مارتا ہو لیکن ظاہر میں وہ بالکل ساکت و صامت ہو۔ مولانا آزاد کی تحریر میں اصل زور ادبیت اور عبارت آرائی پر تھا جبکہ مولانا فراہی کی تحریر نہایت سادہ لیکن مدلل ہوتی تھی۔ مولانا آزاد سیاست کے میدان کے بھی شہسوار تھے اور دین کی وادی میں بھی ان کا اصل مقام داعی کا تھا جبکہ مولانا فراہی سیاست سے تمام عمر کنارہ کش رہے اور دین و مذہب کے میدان میں بھی ان کا اصل مقام آخر دم تک صرف ایک طالب علم یا زیادہ سے زیادہ ایک مفکر کا رہا ——— چنانچہ مولانا آزاد 'طوطیٔ ہند' تو تھے ہی، ایک وقت ایسا بھی گزرا جب وہ "امام الہند" قرار پائے جبکہ مولانا فراہی سے ان کی زندگی میں بھی اور آج تک صرف کچھ علم دوست لوگ ہی واقف ہو سکے ——— لیکن اس کے برعکس مولانا آزاد تو آندھی کی مانند اٹھے اور بگولے کی طرح رخصت ہو گئے تا آنکہ آج وہ لوگ بھی ان کا نام لینا تک گوارا نہیں کرتے جنہوں نے اپنی قندیلیں خود ان ہی کی شمع سے روشن کی۔ جبکہ مولانا فراہی ایک مستقل طرزِ فکر اور مکتبِ علمی کی بنیاد رکھ گئے

جن کا نام لیوا ایک ادارہ "دائرۂ حمیدیہ" کے نام سے ہندوستان میں اور ایک انجمن مولانا امین احسن اصلاحی کی ذات میں پاکستان میں موجود ہے۔

قرآن مجید سے جو شغف ان دونوں بزرگوں کو تھا، مزاج کے اختلاف کے فرق کی بنا پر اس کا ظہور بھی مختلف صورتوں میں ہوا۔ مولانا آزاد کی تفسیر سورہ فاتحہ اردو ادب کا تو شاہکار (CLASSIC) ہے ہی، قرآن کے جلال و جمال کا بھی ایک حسین مرقع ہے۔ پھر سورہ کہف کے بعض مباحث میں ان کی تحقیق و تدقیق کا تو کوئی جواب ہی نہیں، بایں ہمہ قرآن حکیم کا کوئی مرتب و منضبط فکر وہ پیش نہیں کر سکے۔ جبکہ مولانا فراہیؒ نے قرآن حکیم کے استدلالی پہلو کو واضح کیا۔ اور ایک طرف نظم قرآن کی اہمیت واضح کر کے تدبر قرآن کی نئی راہیں کھولیں اور قرآن پر غور و فکر کے اصول و قواعد از سرِ نو مرتب و مدوّن کئے اور دوسری طرف اپنی بعض تصنیفات میں (جو تاحال مسودات ہی کی صورت میں ہیں!) خالصتہً قرآن حکیم کی روشنی میں ایک نئے علم کلام کی بنیاد رکھ دی ——— جیسا کہ ہم نے عرض کیا، آسمان شبلی کے ان "دو ٹوٹے ہوئے تاروں" سے برصغیر کی موجودہ اسلامی فکر کے دو سوتے پھوٹے ہیں جن کا تذکرہ صورت حال کے صحیح اور مکمل جائزے کے لئے ناگزیر ہے۔

مولانا فراہیؒ ——— کے علمی ورثے کے حامل مولانا امین احسن اصلاحی ہیں۔ جنہوں نے اپنی عملی زندگی کی ابتداء ان کے مشن کی تکمیل کے ارادے اور اس کے لئے عملی جد و جہد کے آغاز ہی سے کی تھی۔ چنانچہ تحصیل علم سے فراغت کے فوراً بعد انہوں نے ایک طرف مولانا فراہیؒ کی یادگار "مدرسۃ الاصلاح" اعظم گڑھ کو سنبھالا دوسری طرف "دائرہ حمیدیہ" قائم کیا۔ تیسری طرف ۱۹۳۶ء میں ماہنامہ "الاصلاح" جاری کیا جس کے ذریعے فکر فراہیؒ کی اشاعت شروع ہوئی۔ و قس علیٰ ہذا ——— لیکن ابھی یہ تمام کام بالکل ابتدائی حالت ہی میں تھے کہ حکیم فراہیؒ کا یہ جانشین ابوالکلام کے معنوی خلیفہ سید ابوالاعلیٰ مودودی کی "دعوتِ اسلامی" کی گھن گرج سے متاثر ہو کر، رختِ سفر باندھ ان کی خدمت میں جا حاضر ہوا۔ اور ایک آدھ نہیں سترہ سال ان کی خفیت کے پیچ و خم میں الجھا رہا۔ ——— تا آنکہ پورے سترہ سال اس دشت کی بادیہ پیمائی

۱؎ اگر مولانا فراہیؒ زندہ ہوتے تو ہمیں یقین ہے کہ وہ مترجمہ کے ان الفاظ میں مولانا اصلاحی سے ضرور شکوہ کرتے:

سرمد در دیں عجب شکستے کردی — ایمان فدائے چشم مستے کردی
عمرے کہ بآیات و احادیث گذشت — رفتی و نثار خود پرستے کردی

(سرمد کی رباعی میں "خود پرستے" کی جگہ "بت پرستے" ہے جسے ہم نے موقع و محل کے لحاظ سے بدل کر مناسب حال کر دیا ہے!)

کے بعد، آج سے دس سال قبل جب آنکھ کھلی اور ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ ماضی بہت پیچھے رہ گیا۔ دائرۂ حمیدیہ اور فکر فراہیؒ کے تمام قدر دان ہندوستان میں رہ گئے۔ یہاں یکہ و تنہا، نہ کوئی رفیق نہ ہمراہ، نہ اسباب نہ وسائل، الغرض بقول ——— "جب آنکھ کھل گئی تو موسم تھا خزاں کا"

ان حالات میں مولانا امین احسن اصلاحی نے جس طرح پھر "جگر لخت لخت" کو جمع کیا اور از سر نو اپنے کام کی ابتداء کی، واقعہ یہ ہے کہ یہ اس بڑھاپے کے عالم میں ان کی جواں ہمتی کی دلیل ہے ——— بہر حال "الاصلاح" کی جگہ "میثاق" کا اجراء ہوا جو قلتِ اعوان و انصار کی بنا پر کچھ عرصہ ہچکولے کھاتی ہوئی کشتی کی مانند چلا اور پھر بند ہو گیا ——— "حلقۂ تدبر قرآن" قائم ہوا جس کے ذریعے چند نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ شروع ہوا۔ لیکن کچھ عرصہ نہایت کامیابی سے چلنے کے بعد ان نوجوانوں کے ادھر ادھر منتشر ہو جانے کی بنا پر اس کا کام بھی بند ہو گیا۱؎ ——— تا آنکہ آج سے ڈھائی سال قبل راقم الحروف، جس نے خود مولانا مودودی کی "تحریک اسلامی" ہی میں آنکھ کھولی تھی اور ان ہی کے واسطے سے مولانا اصلاحی سے متعارف ہوا تھا، لاہور منتقل ہوا اور اسے اللہ نے مولانا کے ان کاموں میں تعاون کی توفیق و سعادت بخشی، تو اُسی کے فضل و کرم سے "میثاق" بھی از سرِ نو جاری ہوا اور بحمد اللہ تاحال جاری ہے۔ "تدبر قرآن" کی جلد اول بھی شائع ہوئی اور مولانا کے درس قرآن و حدیث کی ایک ہفتہ وار نشست کا سلسلہ بھی شروع ہوا جو بفضلہٖ تعالیٰ باقاعدگی سے جاری ہے۔

راقم الحروف کو مولانا اصلاحی سے براہ راست تلمذ کا شرف تو حاصل نہیں تاہم یہ واقعہ ہے کہ قرآن حکیم سے جو قلبی رابطہ اور کسی قدر ذہنی مناسبت اسے حاصل ہوئی ہے وہ مولانا ہی کی تحریروں کے مطالعے سے ہوئی ہے۔ اور راقم کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا کو بھی عمر دراز اور صحت و فراغت عطا فرمائے تاکہ وہ اپنے استاذ مولانا فراہیؒ کے علمی ورثے کو مزید اضافوں کے ساتھ اگلی نسل کو منتقل کر سکیں۔ ان کے شاگردوں کو بھی توفیق دے کہ وہ اس کام کے لئے اپنی زندگیوں کو وقف کرنے کا عزم کر سکیں۔ اور راقم کو بھی اس نیک کام میں تعاون کی سعادت نصیب کئے رکھے! آمین۔

بہر حال فکر فراہیؒ اور سلسلہ تدبر قرآن علی گڑھ اور دیوبند کے درمیانی علمی و فکری سوتوں میں سے ایک ہے جو اپنی کمیت اور حلقۂ اثر کے اعتبار سے تو فی الحال زیادہ اہم نہیں لیکن اپنے امکانات کے اعتبار سے یقیناً نہایت اہم ہے۔ خصوصاً اس لئے کہ اس کی بنیاد بھی خالصتہً قرآن حکیم پر ہے اور اس میں سارا

۱؎ خدا کا شکر ہے کہ ایک عرصے کے بعد اب پھر یہ حلقہ سرگرم کار ہو گیا ہے۔

استدلال بھی قرآن ہی سے کیا جاتا ہے۔ اور تدبّرِ قرآن کا جو خاص اسلوب و منہج اس کے ذریعے عام ہو رہا ہے اس سے انشاء اللہ 'حکمتِ قرآنی' کے بہت سے نئے گوشے سامنے آئیں گے اور فکرِ انسانی کو نئی رہنمائی ملے گی ——— مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنی تصانیف 'حقیقتِ شرک'، 'حقیقتِ توحید' اور 'حقیقتِ تقویٰ' میں ایمان باللہ کے مختلف پہلوؤں سے جس انداز میں بحث کی ہے وہ اگرچہ باصطلاحِ معروف تو 'علم کلام' نہیں، لیکن خالص 'قرآنی علم کلام' ضرور ہے اور اگر مولانا اپنی سکیم کے مطابق معاد اور رسالت پر بھی اسی انداز سے لکھ سکے تو اس طرح خالصۃً قرآن حکیم کی بنیاد پر ایک 'نئے علم کلام' کی ترتیب و تدوین کی راہ کھل جائے گی۔

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی نے اگرچہ کبھی صراحۃً کیا کنایۃً بھی یہ تسلیم نہیں کیا ——— اور ان کی انانیت پسند اور خود پرست (EGO-CENTRIC) شخصیت سے اس کی توقع بھی عبث ہے ——— کہ انہوں نے اپنی تحریک کے اصول و مبادی مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم سے اخذ کئے ہیں[1]۔ تاہم واقعہ یہی ہے کہ ۱۹۳۶ء-۳۷ء

---

[1] اس معاملے میں مودودی صاحب جتنے 'پختہ' واقع ہوئے ہیں اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے (i) نہ تو کبھی نیاز فتحپوری سے حاصل کردہ انشاء پردازی کی بنیادی تربیت کا ذکر فرمایا، (ii) نہ ابوالکلام مرحوم اور خیری برادران سے اخذ کردہ تصوّرِ حکومتِ الٰہیہ پر ان حضرات کا کبھی ذکرِ خیر کیا (iii) اور نہ ہی علامہ اقبال مرحوم کا یہ احسان کبھی علانیہ تسلیم کیا کہ انہوں نے انہیں حیدر آباد دکن ایسی سنگلاخ جگہ سے جہاں بقول خود ان کے کوئی ان سے یہ بھی نہ پوچھتا تھا کہ "تمہارے منہ میں کتنے دانت ہیں"! پنجاب کی اس سرزمین میں پہنچایا جو ہر تحریک اور نئی دعوت حتیٰ کہ دعویٰ نبوت تک کے لئے نہایت زرخیز و سازگار ہے ——— حتیٰ کہ جب علامہ اقبال کا انتقال ہوا اور ملک بھر میں صفِ ماتم بچھ گئی تب بھی مدیر 'ترجمان القرآن' نے کوئی کلمۂ خیر ——— یا کلمۂ تعزیت اپنے مؤقر جریدے میں شائع نہ فرمایا۔ اور پروفیسر یوسف سلیم چشتی راوی ہیں کہ جب خود انہوں نے اس سلسلے میں مودودی صاحب سے استفسار کیا تو انہوں نے جواب میں ارشاد فرمایا "میں اس وقت حالتِ جہاد میں ہوں اور میدانِ قتال میں مُردے دفن کرنے کی فرصت کب ہوتی ہے۔" چشتی صاحب فرماتے ہیں کہ بعد میں جب میں نے یہ دیکھا کہ مودودی صاحب کے حلقے کے جرائد نے مولانا مسعود عالم صاحب ندوی اور چوہدری علی احمد مرحوم کی وفات پر خاص نمبر تک نکالے اور کتابیں شائع کیں تو میں حیران رہ گیا کہ

ع ہم نے انقلابِ چرخِ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں!

کے لگ بھگ جب مسلمانانِ ہند کی قومی و ملی سیاست کا ایک رخ متعین ہو گیا اور اس کی قیادت و سیادت میں انہیں کوئی مقام حاصل نہ ہو سکا تو انہوں نے کسی 'دوسری راہ' پر سوچنا شروع کیا اور اس کے لئے انہیں سارا پلا پلایا اور بالفعل تیار مواد مولانا ابوالکلام آزاد سے مل گیا۔ چنانچہ انہوں نے مولانا آزاد کو ان کی زندگی ہی میں مرحوم قرار دے کر ان کی جگہ خود سنبھالی، ان کی وضع کردہ اصطلاح 'حکومتِ الٰہیہ' کو اپنا نصب العین بنایا (جس کی مزید تشریح خیری برادران کر چکے تھے)، ان کی 'حزب اللہ' کے نقشے پر اپنی 'جماعتِ اسلامی' قائم کر دی اور اپنی 'تحریکِ اسلامی' کو انہی خطوط پر شروع کر دیا جو مولانا آزاد نے متعین کئے تھے۔ لیکن جن پر وہ خود اپنی بعض کمزوریوں کے باعث آگے نہ چل سکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا مودودی اگرچہ ایک بہت بڑے مصنف اور مؤلف ہیں اور بسیار نویسی میں ان کے مدِّ مقابل صرف دو غلام احمد ہی ہیں[1]۔ تاہم دین و مذہب کے میدان میں ان کا اصل مقام ابوالکلام مرحوم ہی کی طرح داعی کا ہے نہ کہ مفکر کا ——— بایں ہمہ چونکہ ان کا وسیع و عریض لٹریچر برصغیر کے طول و عرض میں بھی پھیلا ہے اور مشرقِ وسطیٰ میں بھی! لہٰذا ملتِ اسلامیہ کی جدید مذہبی فکر کے اس جائزے میں ان کا تذکرہ بھی ناگزیر ہے!

مودودی صاحب خود بھی اس امر کے مدعی ہیں اور ان کے بارے میں عام طور پر یہ خیال بھی پایا جاتا ہے کہ وہ 'بیچ کی راس' کے آدمی ہیں۔ یعنی انہوں نے علی گڑھ کی پیدا کردہ متجدّدانہ ذہنیت اور دیوبند کے قدامت پرستانہ مزاج کے مابین ایک درمیانی راہ پیدا کی ہے اور گویا کہ قدیم و جدید کو بہم کر دیا ہے۔ ان کا یہ دعویٰ اس اعتبار سے وزنی بھی ہے کہ ان کی دینی دعوت اور ان کا مذہبی فکر دونوں زیادہ تر جدید تعلیم یافتہ طبقے ہی میں چلے ہیں، اور نہ صرف ملتِ اسلامیہ ہند و پاک بلکہ مشرقِ وسطیٰ کے بعض ممالک کی نوجوان نسل کا بھی ایک خاصہ قابلِ ذکر حصہ ان کے زیرِ اثر آیا ہے ——— ان کے خود 'بیچ کی راس' کے آدمی ہونے کا ہی ثمرہ تھا کہ ابتداءً برصغیر کے تمام درمیانی مکاتبِ فکر کے 'ممبر' ان کی جانب کھنچ آئے[2] چنانچہ جیسا کہ عرض کیا جا

---

[1] یعنی ایک آنجہانی غلام احمد قادیانی اور دوسرے ابھی جہانی غلام احمد پرویز!

[2] یہ ایک دلچسپ امر ہے کہ گذشتہ ہند مذہبی حلقوں میں سے مولانا مودودی کی طرف صرف اہلِ حدیث کے وہ لوگ آئے جو ایک تو غیر مقلد ہونے کے باعث ویسے ہی 'آزاد' ہوتے ہیں، دوسرے یہ واقعہ ہے کہ اس طبقے میں خلافت و امارت وغیرہ کا داعیہ ہمیشہ سے اتنا شدید رہا ہے کہ یہ ہر نئی دعوت پر اسی اُمید میں والہانہ لپکتے ہیں کہ شاید اس کے ذریعے اسلام کی 'نوبت' ختم ہو جائے اور وہ خود کے یہاں اسلام کے اس دورِ نوبت میں اس کے بعد دور مونس و تقیم خوار شاہ ہو جائیں!

تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ قَالُوا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا
عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۚ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ شَيْئًا وَلَا
يَهْتَدُونَ ۝ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ ۖ لَا يَضُرُّكُم
مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۚ إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُم
بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ۝ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ
إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِينَ الْوَصِيَّةِ اثْنَانِ ذَوَا عَدْلٍ
مِّنكُمْ أَوْ آخَرَانِ مِنْ غَيْرِكُمْ إِنْ أَنتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ
فَأَصَابَتْكُم مُّصِيبَةُ الْمَوْتِ ۚ تَحْبِسُونَهُمَا مِن بَعْدِ الصَّلَاةِ
فَيُقْسِمَانِ بِاللَّهِ إِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِي بِهِ ثَمَنًا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ
وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللَّهِ إِنَّا إِذًا لَّمِنَ الْآثِمِينَ ۝ فَإِنْ عُثِرَ عَلَىٰ
أَنَّهُمَا اسْتَحَقَّا إِثْمًا فَآخَرَانِ يَقُومَانِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِينَ اسْتَحَقَّ
عَلَيْهِمُ الْأَوْلَيَانِ فَيُقْسِمَانِ بِاللَّهِ لَشَهَادَتُنَا أَحَقُّ مِن شَهَادَتِهِمَا
وَمَا اعْتَدَيْنَا إِنَّا إِذًا لَّمِنَ الظَّالِمِينَ ۝ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَن يَأْتُوا بِالشَّهَادَةِ
عَلَىٰ وَجْهِهَا أَوْ يَخَافُوا أَن تُرَدَّ أَيْمَانٌ بَعْدَ أَيْمَانِهِمْ ۗ وَاتَّقُوا
اللَّهَ وَاسْمَعُوا ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ۝ يَوْمَ
يَجْمَعُ اللَّهُ الرُّسُلَ فَيَقُولُ مَاذَا أُجِبْتُمْ ۖ قَالُوا لَا عِلْمَ لَنَا ۖ
إِنَّكَ أَنتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ ۝ إِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ
نِعْمَتِي عَلَيْكَ وَعَلَىٰ وَالِدَتِكَ إِذْ أَيَّدتُّكَ بِرُوحِ الْقُدُسِ تُكَلِّمُ
النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۖ وَإِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَاةَ
وَالْإِنجِيلَ ۖ وَإِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِإِذْنِي فَتَنفُخُ
فِيهَا فَتَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِي ۖ وَتُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ بِإِذْنِي ۖ
وَإِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِي ۖ وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَنكَ إِذْ
جِئْتَهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ إِنْ هَٰذَا إِلَّا
سِحْرٌ مُّبِينٌ ۝ وَإِذْ أَوْحَيْتُ إِلَى الْحَوَارِيِّينَ أَنْ آمِنُوا بِي وَ
بِرَسُولِي قَالُوا آمَنَّا وَاشْهَدْ بِأَنَّنَا مُسْلِمُونَ ۝ إِذْ قَالَ

الْحَوَارِيُّونَ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ أَن يُنَزِّلَ عَلَيْنَا
مَائِدَةً مِّنَ السَّمَاءِ ۖ قَالَ اتَّقُوا اللَّهَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝
قَالُوا نُرِيدُ أَن نَّأْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوبُنَا وَنَعْلَمَ أَن قَدْ
صَدَقْتَنَا وَنَكُونَ عَلَيْهَا مِنَ الشَّاهِدِينَ ۝ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ
اللَّهُمَّ رَبَّنَا أَنزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِّنَ السَّمَاءِ تَكُونُ لَنَا عِيدًا لِّأَوَّلِنَا
وَآخِرِنَا وَآيَةً مِّنكَ ۖ وَارْزُقْنَا وَأَنتَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ ۝ قَالَ اللَّهُ
إِنِّي مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۖ فَمَن يَكْفُرْ بَعْدُ مِنكُمْ فَإِنِّي أُعَذِّبُهُ
عَذَابًا لَّا أُعَذِّبُهُ أَحَدًا مِّنَ الْعَالَمِينَ ۝ وَإِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَى
ابْنَ مَرْيَمَ أَأَنتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلَٰهَيْنِ مِن
دُونِ اللَّهِ ۖ قَالَ سُبْحَانَكَ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي بِحَقٍّ ۚ
إِن كُنتُ قُلْتُهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ ۚ تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي وَلَا أَعْلَمُ مَا
فِي نَفْسِكَ ۚ إِنَّكَ أَنتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ ۝ مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَا أَمَرْتَنِي
بِهِ أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ
فِيهِمْ ۖ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنتَ أَنتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنتَ عَلَىٰ
كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۝ إِن تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۖ وَإِن تَغْفِرْ
لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ قَالَ اللَّهُ هَٰذَا يَوْمُ يَنفَعُ الصَّادِقِينَ
صِدْقُهُمْ ۚ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا
أَبَدًا ۚ رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ۚ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝
لِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا فِيهِنَّ ۚ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ
قَدِيرٌ ۝

اے ایمان والو! ان پاکیزہ چیزوں کو حرام نہ ٹھہراؤ جو خدا نے تمہارے لیے جائز کی ہیں، اور نہ حدود سے تجاوز کرو۔ اللہ حدود سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ خدا نے تمہیں جو حلال و طیب چیزیں بخشی ہیں ان کو برتو اور اس اللہ سے ڈرتے رہو جس پر تم ایمان لائے ہو۔ تمہاری قسموں میں جو غیر ارادی ہیں ان پر تو اللہ تم سے مواخذہ نہیں کرے گا لیکن جن قسموں کو تم نے پختہ کیا ہے ان پر مواخذہ کرے گا۔

سو اس کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے اس معیار کا جو تم عام طور پر اپنے اہل وعیال کو کھلاتے ہو یا ان کو کپڑے پہنانا یا ایک غلام کو آزاد کرنا ہے۔ جو اس کی مقدرت نہ رکھتا ہو تو وہ تین دن کے روزے رکھ دے۔ یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جبکہ تم قسم کھا بیٹھو۔ اور اپنی قسموں کی حفاظت رکھو۔ اس طرح اللہ تمہارے لیے اپنے احکام کی وضاحت کرتا ہے تاکہ تم اس کے شکر گزار رہو۔ ۸۷ - ۸۹

اے ایمان والو، شراب، جوا، تھان اور پانسے کے تیر بالکل نجس شیطانی کاموں میں سے ہیں تو ان سے بچو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ شیطان تو بس یہ چاہتا ہے کہ تمہیں شراب اور جوئے میں لگا کر تمہارے درمیان دشمنی اور کینہ ڈالے اور تمہیں اللہ کی یاد اور نماز سے روکے تو بتاؤ کیا اب تم ان سے باز آتے ہو! ۔ اور اللہ کی اطاعت کرو، رسول کی اطاعت کرو اور بچتے رہو۔ اگر تم اعراض کرو گے تو جان رکھو کہ ہمارے رسول کے ذمہ صرف واضح طور پر پہنچا دینا ہے۔ ایمان لانے والوں اور عمل صالح کرنے والوں پر اس چیز کے باب میں کوئی گناہ نہیں جو انہوں نے کھائی جب کہ انہوں نے تقویٰ اختیار کیا، ایمان لائے اور پھر عمل صالح کیا، پھر تقویٰ اختیار کیا اور ایمان لائے، پھر تقویٰ اختیار کیا اور خوبی کے ساتھ اس کا حق ادا کیا اور اللہ خوب کاروں کو دوست رکھتا ہے۔ ۹۰-۹۳

اے ایمان والو! اللہ تمہاری کسی ایسے شکار سے آزمائش کرے گا جو تمہارے ہاتھوں اور نیزوں کی زد میں آ جائے گا تاکہ اللہ دیکھے کہ کون اس سے غیب میں ڈرتا ہے۔ اور جس نے اس کے بعد حدود سے تجاوز کیا تو اس کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ اے ایمان والو! حالت احرام میں شکار نہ کیجیو۔ اور جو تم میں سے اس کو قصداً مارے گا تو اس کا بدلہ اسی طرح کا جانور ہے جیسا کہ اس نے مارا ہے جس کا فیصلہ تم میں سے دو معتبر کریں گے۔ یہ نیاز کی حیثیت سے خانہ کعبہ کو پہنچایا جائے۔ یا کفارہ دینا ہوگا، مسکینوں کو کھانا یا اسی کے برابر روزے رکھنے ہوں گے۔ تاکہ وہ اپنے کئے کا وبال چکھے۔ جو ہو چکا اللہ نے اس سے درگزر کیا۔ لیکن جو کوئی پھر کرے گا تو اللہ اس سے انتقام لے گا اور اللہ غالب اور انتقام والا ہے۔ اور تمہارے لیے دریا کا شکار اور اس کا کھانا جائز کیا گیا، تمہارے اور قافلوں کے زادراہ کے لئے اور خشکی کا شکار جب تک تم احرام میں ہو، تم پر حرام کیا گیا۔ اس اللہ سے ڈرتے

رہو جس کے حضور میں سب حاضر کئے جاؤ گے۔ اللہ نے کعبہ، حرمت والے گھر کو، لوگوں کے لیے مرکز بنایا اور حرمت کے مہینوں، قربانی کے جانوروں اور گلے میں پٹے پڑے جانوروں کو شعیرہ ٹھہرایا۔ یہ اس لیے کہ تم جانو کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ جان رکھو کہ اللہ سخت عذاب دینے والا بھی ہے اور بڑا بخشنے والا اور مہربان بھی۔ رسول پر صرف پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے، اللہ جانتا ہے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو۔ کہہ دو کہ ناپاک اور پاک دونوں یکساں نہیں ہو سکتے اگرچہ ناپاک کی کثرت تمہیں فریفتہ کرنے والی ہو، پس اللہ سے ڈرتے رہو اے اہل عقل تاکہ تم فلاح پاؤ۔ ۹۴ - ۱۰۰

اے ایمان والو، ایسی باتوں سے متعلق سوال نہ کرو جو اگر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں گراں گزریں اور اگر تم ان کے بابت ایسے زمانے میں سوال کرو گے جب قرآن اتر رہا ہے تو تم پر ظاہر کر دی جائیں گی۔ اللہ نے ان سے درگزر فرمایا۔ اللہ بخشنے والا اور بردبار ہے۔ اسی طرح کی باتیں تم سے پہلے ایک قوم نے پوچھیں تو وہ ان کے منکر ہو کے رہ گئے۔ اللہ نے تو نہ بحیرہ مشروع کیا، نہ سائبہ، نہ وصیلہ، نہ حام۔ جنہوں نے کفر کیا ہے وہ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں اور ان میں سے اکثر سمجھ سے عاری ہیں۔ اور جب ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ اس چیز کی طرف آؤ جو اللہ نے اتاری ہے اور رسولؐ کی طرف آؤ تو جواب دیتے ہیں کہ ہمارے لیے وہی کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا اس صورت میں بھی جب کہ ان کے باپ دادا نہ کچھ جانتے رہے ہوں نہ ہدایت پر رہے ہوں؟ اے ایمان والو، تم اپنی فکر رکھو، اگر تم ہدایت پر ہو تو جو گمراہ ہوا وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑے گا۔ اللہ ہی کی طرف تم سب کا پلٹنا ہے، وہ تمہیں بتائے گا جو کچھ تم کرتے رہے ہو۔ ۱۰۱-۱۰۵

اے ایمان والو، تمہارے درمیان گواہی بوقت وصیت جب کہ تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ پہنچا ہو اس طرح ہے کہ دو معتبر آدمی تم میں سے گواہ ہوں۔ یا دو دوسرے تمہارے غیروں میں سے اگر تم سفر میں ہو اور وہیں تمہیں موت کی مصیبت آ پہنچے۔ تم ان کو نماز کے بعد روک لو۔ پس وہ اللہ کی قسم کھائیں۔ اگر تمہیں شک ہو۔ کہ ہم اس کے بدلے میں کوئی قیمت قبول نہیں کریں گے اگرچہ کوئی قرابت دار ہی کیوں نہ

ہو اور نہ ہم اللہ کی گواہی کو چھپائیں گے۔ اگر ہم ایسا کریں تو بے شک ہم گنہگار ٹھہریں۔
پس اگر پتہ چلے کہ یہ دونوں کسی حق تلفی کے مرتکب ہوئے ہیں تو انکی جگہ دو سرے
دو ان میں سے کھڑے ہوں جن کی مقدم گواہوں نے حق تلفی کی ہے پس وہ اللہ کی
قسم کھائیں کہ ہماری گواہی ان دونوں کی گواہی سے زیادہ راست ہے اور ہم نے کوئی تجاوز
نہیں کیا ہے، اگر ہم نے ایسا کیا ہے تو ہم ظالم ٹھہریں۔ یہ طریقہ اس امر کے قرین ہے
کہ وہ ٹھیک ٹھیک گواہی دیں یا اس بات سے ڈریں کہ ان کی گواہی کے بعد ان کی گواہی
رد ہو جائے گی اور اللہ سے ڈرو اور سنو۔ اللہ نافرمانوں کو راہ یاب نہیں
کرتا۔ ۱۰۶-۱۰۸

اس دن کو یاد رکھو جس دن اللہ سب رسولوں کو جمع کرے گا پھر پوچھے گا کہ
تمہیں کیا جواب ملا؟ وہ کہیں گے ہمیں کچھ علم نہیں، غیب کی باتوں کا جاننے والا تو
بس تو ہی ہے۔ جب کہ اللہ کہے گا، اے عیسیٰ ابن مریم! میرے اس فضل کو یاد کرو جو
میں نے تم پر اور تمہاری والدہ پر کیا۔ جب کہ میں نے روح القدس سے تمہاری تائید کی
تم لوگوں سے کلام کرتے تھے گہوارے میں بھی اور ادھیڑ ہو کر بھی۔ اور یاد کرو جبکہ میں
نے تمہیں کتاب و حکمت اور تورات و انجیل کی تعلیم دی۔ اور یاد کرو جب کہ تم مٹی سے ایک
صورت پرندے کی صورت کی مانند میرے حکم سے بناتے تھے پھر تم اس میں پھونک مارتے تھے
تو وہ میرے حکم سے پرندہ بن جاتی تھی اور تم اندھے اور کوڑھی کو میرے حکم سے اچھا کر
دیتے تھے اور یاد کرو جب کہ تم مردوں کو میرے حکم سے نکال کھڑا کرتے تھے اور یاد کرو
جبکہ بنی اسرائیل کے شر کو میں نے تم سے دور رکھا جب کہ تم ان کے پاس کھلی ہوئی نشانیاں
لے کر آئے تو ان کے کافروں نے کہا کہ یہ تو بس صریح جادو ہے۔ اور یاد کرو جب کہ میں نے
حواریوں کی طرف وحی کی کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ تو وہ بولے کہ ہم ایمان لائے اور
تو گواہ رہ کہ ہم مسلم ہیں۔ یاد کرو جب کہ حواریوں نے کہا کہ اے عیسیٰ ابن مریم کیا تمہارا
رب یہ کر سکتا ہے کہ ہم پر آسمان سے ایک خوان اتارے۔ اس نے کہا اللہ سے ڈرو اگر
تم سچے مومن ہو۔ وہ بولے کہ ہم چاہتے ہیں کہ ہم اس میں سے کھائیں اور ہمارے دل مطمئن
ہوں اور ہم یہ جان لیں کہ تو نے سچ کہا اور ہم اس کی گواہی دینے والے بنیں۔ عیسیٰ ابن مریم
نے دعا کی، اے اللہ، ہمارے پروردگار، تو ہم پر آسمان سے ایک خوان اتار جو ہمارے

لیے ایک یادگار بن جائے، ہمارے اگلوں اور پچھلوں کے لیے اور تیری طرف سے ایک نشانی
ٹھہرے۔ عطا فرما تو بہترین عطا فرمانے والا ہے۔ اللہ نے فرمایا، میں یہ خوان ضرور
تم پر اتاروں گا لیکن اس کے بعد جو تم میں سے کفر کرے گا تو میں اس کو سزا بھی وہ دوں
گا جو جہان والوں میں سے کسی کو نہ دوں گا۔ اور یاد کرو جب کہ اللہ پوچھے گا کہ اے
عیسیٰ ابن مریم! کیا تم نے لوگوں کو کہا تھا کہ مجھ کو اور میری ماں کو خدا کے سوا معبود بناؤ۔
وہ جواب دے گا تو پاک ہے، میرے لیے روا نہ تھا کہ میں وہ بات کہوں جس کا مجھے کوئی
حق نہیں۔ اگر میں نے یہ کہی تو تو اسے جانتا ہے۔ تو جانتا ہے جو کچھ میرے دل میں ہے،
پر میں نہیں جانتا جو تیرے دل میں ہے۔ غیب کی باتوں کا جاننے والا تو بس تو ہی ہے۔ میں نے
تو ان سے وہی بات کہی جس کا تو نے مجھے حکم دیا کہ اللہ کی بندگی کرو جو میرا بھی رب ہے اور
تمہارا بھی۔ اور میں ان پر گواہ رہا جب تک ان میں موجود رہا پھر جب تو نے مجھے اٹھا لیا تو
تو ہی ان پر نگران رہا اور تو تو ہر چیز پر گواہ ہے ہی۔ اگر تو ان کو سزا دے تو یہ تیرے
بندے ہیں اور اگر تو انہیں بخش دے تو تو غالب اور حکمت والا ہے۔ اللہ فرمائے گا، آج
سچوں کو ان کی سچائی کے نفع پہنچانے کا دن ہے۔ ان کے لیے باغ ہوں گے جن کے نیچے
نہریں جاری ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا، اور وہ اللہ
سے راضی ہوئے۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے سب
کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

۲۳۔ الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝ ۸۷-۸۸

'طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ' اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں تمہارے لیے حلال ٹھہرائی ہیں
اگرچہ وہ سب طیبات کے حکم میں ہیں اس وجہ سے یہاں اس لفظ کے اضافہ کی بظاہر ضرورت
نہیں معلوم ہوتی لیکن اس کا ایک خاص فائدہ ہے۔ وہ یہ کہ بعض اوقات چیز تو فی الاصل جائز ہوتی
ہے لیکن کسی خارجی سبب سے اس کو خباثت لاحق ہو جاتی ہے۔ مثلاً ایک جانور حلال ہے لیکن اس

کو ذبح نہیں کیا گیا یا ذبح تو کیا گیا لیکن اس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا یا اس کو کسی تھان یا استھان کی نذر کیا گیا تو ان صورتوں میں وہ جانور جائز ہونے کے باوجود طیب، پاکیزہ نہیں رہے گا، اس وجہ سے وہ ناجائز قرار پائے گا۔

'لا تعتدوا' یہاں 'تحرموا' کا مقابل ہے۔ یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ کی جائز کردہ چیزوں میں سے 'طیبات' کو حرام ٹھہرانا جائز نہیں ہے اسی طرح اس کی حرام کردہ چیزوں کو حلال بنا لینا بھی جائز نہیں ہے۔ یہ 'اعتداء' یعنی اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حدود سے تجاوز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ساری چیزیں ہمارے لیے پیدا کی ہیں، ہمیں ان کے کھانے پینے اور برتنے کی اجازت ہے، گنتی کی چند چیزیں ہیں جو حرام قرار دی گئی ہیں۔ ان کی حیثیت اللہ کے حدود کی ہے اور حدود کو لانگنے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص ان حدود سے آگے بڑھنے کی جسارت کرتا ہے تو وہ محارم الٰہی کے حدود میں مداخلت کرتا ہے، اللہ تعالیٰ ایسے گستاخوں اور بیوقوفوں کو پسند نہیں کرتا۔ 'پسند نہیں کرتا' یعنی ان سے نفرت کرتا ہے۔ لفظ 'اعتداء' کا یہی مفہوم آگے آیت ۹۴ میں بھی ہے۔

ہم اوپر تمہید میں اشارہ کر چکے ہیں کہ اس سورہ کے شروع میں جو احکام بیان ہوئے ہیں اس سے متعلق جو سوالات بعد میں پیدا ہوئے یا پیدا ہو سکتے تھے، اب آخر میں ان کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ پیچھے مڑ کر سورہ کی آیات ۱-۲ پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ عہد و پیمان کی پابندی کی تمہید کے بعد یہ بتایا ہے کہ تمہارے لیے تمام چوپائے جائز ٹھہرائے گئے ہیں بجز چند مستثنیات کے جو یہ ہیں۔ اب ان سے متعلق کئی سوالات ہیں جو ذہن میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اگر اللہ کے نام پر باندھے ہوئے عہد و پیمان کی پابندی کی اہمیت دین میں اس درجہ ہے تو کوئی شخص اگر شریعت الٰہی کے خلاف کسی چیز کو اپنے اوپر حرام یا حلال ٹھہرانے کی قسم کھا بیٹھے تو اس کا کیا حکم ہے یا کوئی شخص اپنی کھائی ہوئی قسم کو توڑ دے تو اس کے باب میں کیا ہدایت ہے؟ اگر شعائر الٰہی، ہدی اور قلائد وغیرہ کی حرمت کی اس درجہ تاکید ہے تو جو جانور قدیم زمانے سے مذہبی رسوم ہی کی بنا پر محرم چلے آ رہے ہیں مثلاً بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام، ان کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ یہ اور ان کے علاوہ دوسرے متعدد سوالات ابتدا میں بیان کردہ احکام سے متعلق پیدا ہوئے اب یہ حصہ آیات ان سوالوں کو لیتا ہے اور آگے کی آیات میں ان کے جواب دیتے ہیں۔ سب سے پہلے یہ جامع اور اصولی بات فرمائی کہ خدا کی شریعت نے جو چیز جائز ٹھہرائی ہے

اس کو نہ تو حرام قرار دو اور نہ جن چیزوں سے روکا ہے ان کو جائز بناؤ۔ 'حرام ٹھہرانے' سے مراد کسی شے کو اس حیثیت سے اپنے لئے یا دوسروں کے لئے ممنوع ٹھہرانا ہے کہ اس کے متعلق وہ یہ گمان یا دعوے کرے کہ یہ خدا کا حکم ہے، یا اس پر عذاب و ثواب مترتب ہوتا ہے یا یہ نیکی اور فضیلت میں داخل ہے۔ اگر اس قسم کی کوئی بات نہ ہو بلکہ مجرد ذوق یا بتقاضائے صحت یا بربنائے احتیاط و کفایت کسی چیز کا استعمال کوئی شخص ترک کر دے تو یہ چیز تحریم میں داخل نہیں ہے۔

یہ بات یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ یہ تحریم و تحلیل حاکمیت الٰہی کے حدود میں مداخلت اور نقض میثاق کا نہایت وسیع دروازہ ہے۔ یہ مداخلت جس طرح حرام کو حلال کرنے کی راہ سے ہوتی ہے اسی طرح حلال کو حرام قرار دینے کی راہ سے بھی ہوتی ہے۔ حرام کو حلال کرنے کی راہ تو زیادہ تر خواہشات نفس کی تحریک سے کھلی ہے لیکن حلال کو حرام ٹھہرانے کے معاملہ میں زیادہ دخل مشرکانہ عقائد و اوہام کو رہا ہے۔ چنانچہ مشرکین عرب نے اپنے مشرکانہ تصورات کے تحت بہت سی چیزیں اپنے اوپر حرام کر لی تھیں، آگے آیت ۱۰۳ میں بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام کا ذکر آ رہا ہے۔ مزید تفصیل سورہ انعام میں آئی ہے۔

وَقَالُوا هَٰذِهِ أَنْعَامٌ وَحَرْثٌ حِجْرٌ لَا يَطْعَمُهَا إِلَّا مَنْ نَشَاءُ بِزَعْمِهِمْ وَأَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُورُهَا وَأَنْعَامٌ لَا يَذْكُرُونَ اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا افْتِرَاءً عَلَيْهِ ۚ سَيَجْزِيهِمْ بِمَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ○ وَقَالُوا مَا فِي بُطُونِ هَٰذِهِ الْأَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِذُكُورِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلَىٰ أَزْوَاجِنَا ۖ وَإِنْ يَكُنْ مَيْتَةً فَهُمْ فِيهِ شُرَكَاءُ ۚ سَيَجْزِيهِمْ وَصْفَهُمْ ۚ إِنَّهُ حَكِيمٌ عَلِيمٌ۔ ۱۲۸-۱۳۹

(اور وہ کہتے ہیں کہ فلاں فلاں چوپائے اور فلاں فلاں قسم کی زمینی پیداوار حرام ہے، ان کو نہیں کھا سکتے مگر وہی جن کو ہم بتائیں، ان کا یہ دعوے محض اٹکل پچو ہے۔ اور کچھ جانور ہیں جن پر سواری حرام کر دی گئی ہے اور کچھ پر خدا کا نام نہیں لیتے، خدا پر جھوٹ باندھتے ہوئے، اللہ ان کے اس افترا کا ان کو جلد بدلہ دے گا اور وہ کہتے ہیں کہ جو بچے فلاں ماداؤں کے پیٹ میں ہیں وہ خاص مردوں ہی کے لیے جائز ہیں، عورتوں کے لیے وہ حرام ہیں، اور اگر وہ مردہ پیدا ہوں تو مرد اور عورت دونوں ان کو کھا سکتے ہیں، اللہ ان کے اس فتوے کی ان کو جلد سزا دے گا، وہ حکیم و علیم ہے۔) اسی طرح یہود کے متعلق بھی قرآن میں بیان ہوا ہے کہ بہت سی چیزیں انہوں نے اپنے من گھڑت فتووں، اپنے لایعنی سوالات اور اپنے مشرکانہ اوہام کی بنا پر اپنے اوپر حرام کر لیں۔ قرآن نے اس قسم کی خود مختارانہ تحریم و تحلیل کو توحید اور ایمان

کے منافی قرار دیا۔ فرمایا کہ تمام حلال و طیب چیزیں جو خدا نے تمہیں بخشی ہیں ان کو کھاؤ پیو اور برتو، اپنے زمانۂ جاہلیت کے توہمات کی بنا پر ان سے احتراز نہ کرو اور اس اللہ سے ڈرو جس پر ایمان لائے ہو۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ۭ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ۭ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ - ۸۹

(معاشرے میں قسم کی اہمیت)

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ۔ اس ٹکڑے میں جو مضمون بیان ہوا ہے، یہی مضمون، معمولی لفظی اختلاف کے ساتھ، سورہ بقرہ آیات ۲۲۴ - ۲۲۵ میں گزر چکا ہے۔ وہاں ہم نے اس پر مفصل بحث کی ہے۔ وہاں مسئلۂ ایلاء کے تعلق سے قسم کی اہمیت کا ذکر ہوا تھا۔ یہاں اوپر کی بیان کردہ تحریم و تحلیل کے تعلق سے اس کا ذکر ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کی غیر ارادی قسموں پر تو کوئی مواخذہ نہیں کرے گا لیکن جو قسمیں دل کے عزم و ارادہ سے ظہور میں آئیں گی اور جن کے ذریعہ سے کوئی عہد و پیمان بندھے گا، جن سے حقوق و فرائض پر کوئی اثر مترتب ہوگا، جو کسی پہلو سے شریعت کی تحریم و تحلیل پر اثر انداز ہوں گی ان پر اللہ ضرور مواخذہ فرمائے گا۔ اللہ کے نام کو، جیسا کہ بقرہ میں فرمایا ہے، خلاف شرع یا مجبوری قسموں کا ہدف بنانے کی اجازت نہیں ہے۔ قسم قول و قرار، شہادات اور عہد و پیمان کی بنیاد ہے اور عہد و پیمان نہ صرف تمام معاشرتی، اجتماعی اور سیاسی حقوق و فرائض کی اساس ہے بلکہ، جیسا کہ ہم اس سورہ کی پہلی آیت يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (الآیہ) کے تحت تفصیل کے ساتھ بیان کر آئے ہیں، اس عہد و میثاق کی بھی اساس ہے جو ہم نے اپنے رب کے ساتھ باندھا ہے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ آدمی قسم کے معاملے میں نہایت محتاط رہے، کوئی قسم بے ضرورت یا خلاف شرع نہ کھائے، جو قسم کھائے خلاف شرع نہ ہو تو وہ پوری کرے، اگر کوئی قسم کھانے کے بعد توڑے تو اس کا کفارہ ادا کرے تاکہ وہ قسم کے معاملے میں سہل انگار، بے پروا اور بالکل غیر ثقہ اور ناقابل اعتبار آدمی بن کے نہ رہ جائے، اس لیے کہ اس قسم کا آدمی نہ معاشرے

کی ذمہ داریوں کا اہل ہے نہ میثاق الٰہی کی ذمہ داریوں کا۔

(قسم کا کفارہ)

فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ الآیہ۔ اس کا کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو اس معیار کا کھانا کھلائے جس معیار کا کھانا وہ اپنے اہل و عیال کو کھلاتا ہے یا ان کو کپڑے پہنائے یا ایک غلام آزاد کرے۔ اگر اس کی مقدرت نہ ہو تو تین دن کے روزے رکھ دے۔

(قرآن میں توضیحی آیات کا مفہوم)

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ توضیحی آیات ہیں جو بعد میں پیدا ہونے والے سوالات کے، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، جواب میں نازل ہوئی ہیں۔ شریعت و ہدایت تمام تر اللہ تعالیٰ کا بندوں پر فضل و احسان ہے اور اگر اس کے کسی اجمال کی وضاحت خود اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہو جائے تو یہ اس کا مزید احسان ہے، پھر اس توضیح میں اگر بندوں کے لیے سہولت کے بھی بہت سے پہلو ملحوظ ہوں، جیسا کہ غیر ارادی قسموں اور کفارہ کے معاملہ میں یہاں ملحوظ ہیں، تو گویا احسان کے گوناگوں پہلو جمع ہو گئے۔ اس کا فطری تقاضا یہی ہو سکتا ہے کہ بندے اپنے پروردگار کے زیادہ سے زیادہ شکر گزار بنیں۔ اگر اس ساری توضیح و تفصیل کے بعد بھی انہوں نے اس نعمت کی قدر نہ کی تو یہ انتہائی کفران نعمت ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۗءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ (۹۱

خمر و میسر پر بقرہ ۲۱۹ میں اور انصاب و ازلام پر مائدہ ۳ میں بحث گزر چکی ہے۔ شراب اور جوا، جیسا کہ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ہم بیان کر آئے ہیں، دونوں توام بھائیاں ہیں۔ کم از کم عرب جاہلیت کی سوسائٹی میں ان کی حیثیت یہی تھی۔ خمر کے متعلق یہ دعوے بے بنیاد ہے کہ اس کا اطلاق صرف انگوری شراب ہی پر ہوتا ہے۔ کلام عرب سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ اور یوں بھی تو شراب کی حرمت کی اصل علت، جیسا کہ نساء کی آیت ۴۳ سے واضح ہے، اس کے اندر نشہ کا پایا جانا ہے۔ اس وجہ سے ہر نشہ آور چیز کا حکم یہی ہوگا، خواہ وہ انگوری ہو یا غیر انگوری۔ اور شریعت کے اس حکیمانہ اصول کے مطابق کہ جس کی مقدار کثیر حرام ہے اس کی مقدار قلیل بھی حرام ہے، اس کی ہر مقدار حرام ہوگی تاکہ فتنہ کا دروازہ کلیۃً بند ہو جائے۔

رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ۔ 'رجس' اور 'نجس' پر دوسرے مقام میں ہم بحث کر

چکے ہیں۔ معناً ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ 'من عمل الشیطان' یعنی یہ شیطان کی ایجادات اور اس کی کارستانیوں میں سے ہیں اور یہ حربے اس نے اس لیے ایجاد کئے ہیں کہ بنی آدمؑ کو شریعت کی صراطِ مستقیم سے بہکانے کا جو عہد اس نے کر رکھا ہے اس کو پورا کر سکے۔ ان کے اندر اگر کوئی پہلو نفع کا نظر آتا ہے تو یہ محض ایک نظر فریب ملمع ہے۔ ان کا ضرر، ان کے نفع کے مقابل میں، جیسا کہ بقرہ کی تفسیر میں واضح ہو چکا ہے، اتنا زیادہ ہے کہ اس کے سامنے اس حقیر نفع کی کوئی قیمت نہیں۔

إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۔' 'فی الخمر والمیسر' میں 'فی' اشتغال و انہماک کے مضمون پر دلیل ہے۔ یعنی شیطان نے یہ فتنے اس لیے ایجاد کئے ہیں کہ تمہیں ان میں لگا کر تمہارے درمیان برابر دشمنی اور انتقام کی آگ بھڑکاتا رہے۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ جس معاشرے میں یہ وبا پھیل جائے اس میں یا تو عفت، عزت، ناموس اور وفا و حیا کا احساس مٹ جائے گا جیسا کہ مغرب زدہ سوسائٹی میں آج مشاہدہ ہو رہا ہے اور یہ بجائے خود ایک عظیم حادثہ ہے اور اگر ان کی کوئی رمق باقی رہے گی تو ناگزیر ہے کہ آئے دن ان کی بدولت تلواریں کھنچی رہیں۔ عرب عفت و عصمت، خودداری اور غیرت کے معاملے میں بڑے حساس تھے اور یہ ان کی بہت بڑی خوبی تھی لیکن ساتھ ہی شراب اور جوئے کے بھی رسیا تھے اس وجہ سے جام و سنداں کی یہ بازی ان کے لیے بڑی مہنگی پڑ رہی تھی۔ جہاں کسی نے شراب کی بدمستی میں کسی کے عزت و ناموس پر حملہ کیا، کسی کی تحقیر کی، کسی کو چھیڑا یا جوئے میں کوئی چھینٹ کی (اور یہ چیزیں جوئے اور شراب کے لوازم میں سے ہیں) وہیں فریقین تلواریں سونت لیتے اور افراد کی یہ لڑائی چشم زدن میں قوموں اور قبیلوں کی جنگ بن جاتی اور انتقام در انتقام کا ایسا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا کہ صرف مہینے اور سال نہیں بلکہ پوری صدی گزر کر بھی یہ آگ ٹھنڈی نہ پڑتی۔ چنانچہ عرب کی تاریخ میں ایسی جنگیں موجود ہیں جن کی آگ جوئے یا شراب خانہ خراب ہی نے بھڑکائی اور پوری ایک صدی تک وہ آگ نہ بجھی۔ بہرحال یہ چیز یا تو دیوث بناتی ہے یا خانہ خراب اور ان دونوں میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جس کو کوئی سلیم الفطرت معاشرہ گوارا کر سکے۔

'وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ' 'ذکر اللہ' کے بعد 'صلوٰۃ' کا ذکر عام کے بعد خاص کا ذکر ہے جس سے ان دونوں کا ربط واضح ہوتا ہے۔ اسلام نے زندگی کی تمام رفعت و عظمت ذکر الٰہی کے ساتھ وابستہ کی ہے۔ جو شخص خدا سے غافل ہوا وہ خود اپنی

قدر و قیمت سے بالکل بے خبر ہو جاتا ہے۔ 'نسوا اللہ فانساھم انفسھم' میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ اللہ کی یاد کا خاصہ یہ ہے کہ وہ انسان کو زندگی کی اصل حقیقتوں سے کبھی بے پروا نہیں ہونے دیتی جس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کبھی راہ سے بے راہ نہیں ہوتا۔ اگر کبھی کوئی لغزش ہو جاتی ہے تو خدا کی یاد اس کو سنبھال لیتی ہے۔ برعکس اس کے شراب کا اصل اثر جو انسان پر پڑتا ہے وہ یہی ہے کہ وہ اس کو زندگی کی اصل حقیقتوں سے ہٹا کر ایک خیالی دنیا میں لے جا کر پھینک دیتی ہے اور اس خیالی دنیا کا وہ ایسا دیوانہ ہو جاتا ہے کہ پھر جس طرح سگ گزیدہ پانی سے ڈرتا ہے اسی طرح وہ زندگی کی اصل حقیقت سے ڈرنے لگتا ہے۔ کبھی اس سے دوچار ہونے کی جرأت نہیں کرتا اور اسی حال میں ایک دن اس کی زندگی کا قصہ تمام ہو جاتا ہے ــــ اب ذرا اس انسان کی بدبختی پر غور کیجئے جو زندگی بھر خواب دیکھتا رہا اور کبھی اس کو جاگنے اور زندگی کے انجام پر غور کرنے کی نوبت نہیں آئی ـ!

'فھل انتم منتھون' ـ استفہام عربی زبان میں، جیسا کہ استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب اسالیب القرآن میں وضاحت فرمائی ہے۔ تاکید، اقرار، تنبیہ، انکار، زجر، امر اور تحقیر کے مفہوم کے لیے آتا ہے۔ یہاں موقع دلیل ہے کہ یہ امر کے مفہوم میں ہے جس طرح سورۂ ہود آیت ۱۴ میں "فھل انتم مسلمون" (تو کیا اب تم مسلم بنتے ہو) ہے۔ اس اسلوب امر کے ساتھ زجر، موعظت، تاکید و تنبیہ اور اتمام حجت کا مضمون بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ یہاں غور کیجئے تو اسلوب کلام اس حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے کہ شراب اور جوئے کے مفاسد کی تفصیل اتنے مختلف مواقع پر اور اتنے مختلف پہلوؤں سے تمہارے سامنے آچکی ہے کہ اب اس معاملے میں کسی کے لئے بھی کسی اشتباہ کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے تو بتاؤ اب بھی اس سے باز آتے ہو یا نہیں! ظاہر ہے کہ امر کے سادہ اسلوب میں یہ سارا مضمون نہیں سما سکتا تھا۔

وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَاحْذَرُوا فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ ۔ (۹۲)

یہ اوپر والی تنبیہ کی مزید تاکید ہے کہ شیطان کے بچھائے ہوئے جال سے نکل کر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں داخل ہو جاؤ اور نافرمانی و سرکشی سے بچو۔ اگر اس توضیح و تنبیہ کے بعد بھی تم نے اعراض کیا تو ذمہ داری تمہاری ہوگی، رسول کی ذمہ داری تو صرف خدا کے امر و نہی سے واضح طور پر آگاہ کر دینا ہے اور یہ فرض رسول نے ادا کر دیا جس کے بعد تم پر اللہ کی طرف سے حجت پوری ہو چکی۔ اس

اتمام حجت کے بعد اب جو بے راہ روی اختیار کریں وہ اس کے نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہو کر کریں۔ اس لیے کہ اتمام حجت کے بعد اللہ تعالیٰ کی پکڑ بڑی سخت ہوتی ہے۔

لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (۹۳)

اوپر 'فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ' کے اسلوب میں جو زجر و توبیخ مضمر ہے، اس کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں۔ اسلوب بیان کی اس شدت نے ان لوگوں کو متاثر کیا ہو گا جو شراب کے معاملے میں اس رخصت سے اب تک فائدہ اٹھاتے رہے تھے جو انہیں حاصل تھی۔ انہوں نے یہ محسوس کیا ہو گا کہ شراب کے باب میں بالکل پہلی ہی تنبیہ پر دوسرے بہت سے محتاط اور دور اندیش صحابہؓ کی طرح انہوں نے بھی شراب سے یکقلم توبہ کر لی ہوتی تو خوب ہوتا، ممکن ہے یہ تاخیر جو ان سے ہوئی آخرت میں ان کی کوتاہی میں محسوب ہو اور اس پر کوئی گرفت ہو جائے۔ خاص طور پر اس دوران میں جو لوگ وفات پا چکے ہوں گے ان کے باب میں محتاط لوگوں کے اندر تشویش پیدا ہوئی ہو گی کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ ہو گا؟۔ آیت زیر بحث نے اس قسم کے سارے شبہات دور کر دیے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں پرسش کسی ایسی چیز کے کھانے پینے پر نہیں ہو گی جس کے بارے میں کسی صریح ممانعت کی خلاف ورزی کا ارتکاب نہیں ہوا ہے۔ شریعت الٰہی کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ جس چیز کے باب میں جو حد جب معین ہو گئی لوگ اس حد کا احترام کریں، پھر اگر اس حد میں کچھ اضافہ شریعت کی رو سے ہو جائے تو اس کو مضبوطی کے ساتھ اختیار کر لیں اور اگر اس پر مزید اضافہ ہو جائے تو اس کو بھی اختیار کر لیں اور پھر پوری خوبی، پوری احتیاط اور پورے اخلاص کے ساتھ اس کو نباہیں۔

اس آیت سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ شریعت الٰہی میں احکام کا نزول بالتدریج ہوا ہے اور یہ تدریج بندوں کی سہولت کے پہلو سے اللہ تعالیٰ نے پسند فرمائی ہے اس وجہ سے ان لوگوں پر وہ گرفت نہیں فرمائے گا جنہوں نے اس کی بخشی ہوئی سہولت سے فائدہ اٹھایا ہے، اگرچہ ان لوگوں کو سبقت الی الخیر کا درجہ ملے گا جنہوں نے کسی باب میں ہوا کا رخ پہچان کر اس کے پہلے ہی مرحلہ میں احتیاط اور تقویٰ کا آخری قدم اٹھا دیا۔ مثلاً شراب کی حرمت کا حکم بالتدریج نازل ہوا لیکن دین کے معاملے میں جن کی حس زیادہ تیز تھی وہ پہلے ہی مرحلہ میں اس سے تائب ہو گئے۔ یہ ان کے کمال درجہ فقہ اسلام پر ہونے کی دلیل ہے لیکن اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر بھی رحم فرمائے گا جنہیں اگرچہ یہ درجۂ کمال تو حاصل

نہ ہو سکا لیکن انہوں نے کسی مرحلہ میں حدود الٰہی سے تجاوز نہیں کیا۔

دوسری بات آیت کے الفاظ سے یہ نکلتی ہے کہ اس تدریج کے تین مدارج ہیں۔ یہ بات ایک کلیہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ عمومیت کے لحاظ سے بیان ہوئی ہے۔ بعض معاملات میں قطعی اور آخری حکم پہلی ہی مرتبہ میں آ گیا ہے، بعض میں دوسری مرتبہ میں اور بعض میں حکم کی تکمیل تیسری بار میں ہوئی ہے۔ مثلاً کھانے پینے کے سلسلہ کی حرمتوں کا اجمالی ذکر سورۂ انعام میں بھی ہوا ہے، جو ایک مکی سورہ ہے۔ اس کے بعد اس کی تفصیل اس سورہ (مائدہ) کے آغاز میں آئی ہے جس سے انعام کے بعض اجمالات کی وضاحت ہوئی ہے۔ پھر اس سلسلہ میں کچھ مزید سوالات پیدا ہوئے ہیں جن کی تقریب سے بعض چیزوں کی حرمت جیسا کہ واضح ہو گا، یہاں اس سورہ کے خاتمہ میں بیان ہوئی اور یہ سورہ، جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں، احکام شریعت کے باب میں آخری سورہ ہے۔ اس وجہ سے گویا اس تیسرے مرحلہ میں کھانے پینے سے متعلق احکام کی تکمیل ہو گئی۔ یہ آیت یہ واضح کر رہی ہے کہ جو لوگ ان تینوں مرحلوں میں اللہ کے نازل شدہ احکام و حدود کی پیروی کرتے آئے ہیں ان سے ان چیزوں کے کھانے پر کوئی گرفت نہیں ہو گی جو انہوں نے اس وقت کھائی ہیں جب ان کی صریح حرمت نازل نہیں ہوئی تھی۔

تیسری بات یہ سامنے آتی ہے کہ آیت میں تین بار تقویٰ کا ذکر ہوا ہے۔ پہلی بار تقویٰ کے ساتھ ایمان و عمل صالح کا ذکر ہے، دوسری بار ایمان کا ذکر ہے، تیسری بار احسان کا ذکر ہے۔ تقویٰ کا مفہوم ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ اصلاً یہ لفظ حدود الٰہی کی نگہداشت کے لیے آتا ہے۔ یہاں تین بار اس کا حوالہ احکام کے ان تدریجی مراتب کے لحاظ سے ہوا ہے جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا۔ رہا تقویٰ کے ساتھ ایمان و عمل صالح کا حوالہ تو وہ اس حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں معتبر صرف کسی چیز سے بچنا نہیں بلکہ وہ بچنا معتبر ہے جو ایمان و عمل صالح کے ساتھ ہو۔ اس قید کی ضرورت اس وجہ سے تھی کہ بہت سی چیزوں سے بچنے کے معاملے میں (بالخصوص کھانے پینے کی چیزوں کے معاملے میں) بہت سے لوگ بڑے محتاط اور متقشف ہوتے ہیں حالانکہ ایمان و عمل صالح سے ان کو کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ جوگیوں، سنیاسیوں اور راہبوں سے قطع نظر جو لوگ اعمال سفلیہ کے دلدادہ ہوتے ہیں وہ بھی اپنے اوپر بہت سی پابندیاں عائد کر رکھتے ہیں اور بڑی سختی کے ساتھ ان کی نگہداشت کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس چیز کا دین میں کوئی اعتبار نہیں۔ اعتبار صرف اس احتیاط کا ہے جو ایمان اور عمل صالح کے ساتھ ہو۔ آخر میں تقویٰ کے ساتھ احسان کی جو شرط ہے وہ اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ دین میں جو تقویٰ مطلوب و مقبول ہے وہ

صرف ظاہرداری اور رسوم کی خانہ پری سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے آخری شرط احسان ہے۔ احسان کا مدعا یہ ہے کہ آدمی اللہ کے حدود کی خلاف ورزی سے اس طرح بچے جس طرح اس سے بچنے کا حق ہے۔ وہ ہر حکم کی تعمیل اس طرح کرے گویا وہ خدا کو دیکھ رہا ہے اور اس یقین سے اپنے باطن کو منور رکھے کہ اگر وہ خدا کو نہیں دیکھ رہا ہے تو خدا تو بہرحال اس کو دیکھ رہا ہے۔ یہی احسان تقویٰ کی اصل روح اور حدود الٰہی کا اصل پاسبان ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو انسان تقویٰ اور پرہیزگاری کی نمائش کرتے ہوئے حدود الٰہی کے توڑنے کے لیے ہزار چور دروازے پیدا کر سکتا ہے۔ آخر یہود نے دینداری کے مظاہرے کے ساتھ خدا کی حرام ٹھہرائی ہوئی چیزوں کو جائز کرنے کی کتنی راہیں کھول لیں۔ سبت کے لیے جو حیلۂ شرعی انہوں نے ایجاد کیا اس کی طرف یہاں بھی آگے اشارہ آ رہا ہے۔ یہی صورت اس امت میں بھی پیش آئی۔ یہاں تک کہ کتاب الحیل ہماری فقہ کا ایک جزو بن گئی۔ ایسے دین باز مدعیانِ تقویٰ کی خدا کے ہاں کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو احسان کی صفت سے متصف ہوں۔ 'واللہ یحب المحسنین' میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللَّهُ بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ تَنَالُهُ أَيْدِيكُمْ وَرِمَاحُكُمْ لِيَعْلَمَ اللَّهُ مَن يَخَافُهُ بِالْغَيْبِ ۚ فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَأَنتُمْ حُرُمٌ ۚ وَمَن قَتَلَهُ مِنكُم مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنكُمْ هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ أَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسَاكِينَ أَوْ عَدْلُ ذَٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوقَ وَبَالَ أَمْرِهِ ۗ عَفَا اللَّهُ عَمَّا سَلَفَ ۚ وَمَنْ عَادَ فَيَنتَقِمُ اللَّهُ مِنْهُ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ ذُو انتِقَامٍ ۝ أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ ۖ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ۔ ۹۴-۹۶

سورہ کے شروع، آیت ۱ میں حالت احرام میں شکار کی جو ممانعت وارد ہوئی ہے اس سے متعلق بعض تفصیلات اور بعض سوالوں کے جواب جو بعد میں نازل ہوئے وہ یہاں بیان ہو رہے ہیں۔

'لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللَّهُ بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ تَنَالُهُ أَيْدِيكُمْ وَرِمَاحُكُمْ' یہ اُس آزمائش سے آگاہ فرمایا جا رہا ہے جو حالتِ احرام میں دفعۃً شکار نظر آ جانے کی وجہ سے

پیش آ سکتی ہے۔ چونکہ یہ ممانعت اصلاً کی ہی اس لیے گئی ہے کہ لوگوں کے ایمان و تقویٰ کو جانچا جائے اس لیے پہلے سے خبردار کر دیا گیا کہ ایسے مواقع پیش آئیں گے کہ تم احرام باندھے ہوئے ہو گے اور تمہیں نظر آئے گا کہ ہرنوں اور نیل گایوں کی پوری ڈار کی ڈار ہے جو بالکل تمہارے نیزوں کی زد میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آزمائش کے ان مواقع پر اپنے عزم و ایمان کی حفاظت کرنا، اس طرح پھسل نہ جانا جس طرح بنی اسرائیل سبت کے معاملے میں پھسل گئے۔

اس تنبیہ کی اہمیت اچھی طرح سمجھنے کے لیے چند باتیں ذہن میں مستحضر کر لیجیے۔ ایک تو یہ کہ شکار بجائے خود بڑی رغبت کی چیز ہے بالخصوص اہلِ عرب کے لیے جن کی تفریح اور معاش دونوں چیزوں کا انحصار بڑی حد تک اس زمانے میں شکار ہی پر تھا۔ دوسری یہ کہ جب کسی مرغوب چیز پر کوئی پابندی عائد ہو جائے تو اس کی رغبت اور زیادہ قوی ہو جاتی ہے۔ عربی میں مثل ہے 'الانسان حریص علی ما منع' انسان جس چیز سے روک دیا جائے اس کو بڑا حریص ہو جایا کرتا ہے۔ اس حرص کا نفسیاتی اثر یہ بھی ہوتا ہے کہ جس طرح ساون کے اندھے کو ہر جگہ ہرا ہرا نظر آتا ہے اسی طرح اس کو بھی ہر جگہ وہی چیز نظر آتی ہے جس سے وہ اپنے کو محروم پاتا ہے۔ تیسری یہ کہ یہ مناہی جب اصلاً امتحان کے لیے ہوئی ہے تو بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ ایسے مواقع پیدا فرمائے کہ اس امتحان کا مقصد پورا ہو۔

یہ بات یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ اس امت کے لیے یہ امتحان بنی اسرائیل کے اس امتحان سے مشابہ ہے جو ان کو سبت کے معاملے میں پیش آیا۔ قرآن میں اس کا ذکر اس طرح ہوا ہے۔

إِذْ يَعْدُونَ فِي السَّبْتِ إِذْ تَأْتِيهِمْ حِيتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَيَوْمَ لَا يَسْبِتُونَ لَا تَأْتِيهِمْ كَذَٰلِكَ نَبْلُوهُم بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ۔ ۱۶۳ - اعراف

اور یاد کرو جب کہ وہ سبت کے معاملے حدود الٰہی کی خلاف ورزی کرتے تھے، جب کہ ان کی مچھلیاں ان کے سبت کے دن منہ اٹھائے ہوئے نمودار ہوتی تھیں اور جب سبت کا دن نہ ہوتا تو مچھلیاں نمودار نہ ہوتیں۔ اسی طرح ہم ان کو آزمائش میں ڈالتے تھے بوجہ اس کے کہ وہ ہماری نافرمانی کرتے تھے

ان دونوں مقامات پر غور کیجیے تو دونوں کی مماثلت بالکل واضح ہو جائے گی۔ بنی اسرائیل کی آزمائش کی نوعیت یہ تھی کہ جو دن ان کے سبت کا ہوتا اس دن مچھلیاں منہ اٹھائے ہوئے سطح آب پر نظر آتیں لیکن جو دن سبت کا نہ ہوتا اس دن وہ نظر نہ آتیں۔ اس چیز نے ان کو اس فتنے میں ڈال دیا کہ انہوں

نے سبت کے دن شکار کے لیے ایک حیلہ ایجاد کر لیا۔ اسی طرح اس امت کے امتحان کے بارے میں فرمایا ہے کہ حالت احرام میں بسا اوقات تمہیں ایسا نظر آئے گا کہ شکار بالکل تمہارے ہاتھوں اور تمہارے نیزوں کی زد میں ہے۔ مبادا یہ چیز تمہیں اسی طرح کے کسی فتنہ میں مبتلا کر دے جس طرح کے فتنے میں بنی اسرائیل مبتلا ہو گئے۔

یہاں 'بِشَیْءٍ' کے لفظ، بالخصوص اس کی تنکیر سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ ہر چند یہ آزمائش پیش تو آئے گی لیکن یہ بہت سخت نہیں بلکہ ہلکی ہوگی۔ یہ چیز اس آخری شریعت کے مزاج کو ظاہر کرتی ہے کہ اس کے ہر پہلو میں انسانی فطرت کی پوری پوری رعایت ملحوظ ہے۔

'لِیَعْلَمَ اللّٰہُ مَنْ یَّخَافُہٗ بِالْغَیْبِ' یہ اس آزمائش کا مقصد بیان ہوا ہے۔ 'علم یعلم' کے معنی ہم دوسری جگہ بیان کر چکے ہیں کہ ممیز کرنے کے بھی آتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ یہ امتحان اللہ تعالیٰ نے اس لیے رکھا ہے کہ وہ ان لوگوں کو ممیز کرے جو غیب میں رہتے خدا سے ڈرتے ہیں۔ یہاں مقابل کا جملہ محذوف ہے۔ یعنی ان لوگوں سے ممیز کرے جو غیب میں رہتے خدا سے نہیں ڈرتے۔ ابتلائی احکام سے متعلق ہم یہ حقیقت اس سورہ کے آغاز میں واضح کر چکے ہیں کہ ان کا اصل مقصود خدا کے ساتھ بندوں کی وفاداری کا امتحان ہوتا ہے۔ بظاہر وہ بندوں کے مصالح کے نقطۂ نظر سے ایک عام آدمی کو بے حکمت نظر آتے ہیں لیکن حقیقت میں ایمان بالغیب اور خشیت بالغیب کے جانچنے کے لیے وہی اصل کسوٹی ہوتے ہیں۔

'فَمَنِ اعْتَدٰی بَعْدَ ذٰلِکَ' میں 'بعد ذالک' کا زور اس تنبیہ و تذکیر پر ہے جو یہاں کی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حالت احرام میں شکار کی ممانعت کے بعد یہ آگاہی بھی تمہیں سنا دی گئی ہے کہ اس راہ میں تمہیں اس طرح کی آزمائشیں بھی پیش آنی ہیں جس طرح کی تم سے پہلی امت کو پیش آئی ہیں۔ تو جس نے اس آگاہی کے بعد بھی حدود الٰہی کی خلاف ورزی کی اس کے لئے عذاب دردناک ہے۔

'یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّیْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ وَمَنْ قَتَلَہٗ مِنْکُمْ مُّتَعَمِّدًا الآیۃ' اب یہ اس سوال کا جواب دیا جا رہا ہے کہ کوئی شخص حالت احرام میں ہونے کے باوجود عمداً اس گناہ کا ارتکاب کر بیٹھے تو اس کا کیا حکم ہے؟ ارشاد ہوا کہ ایسا شخص کفارہ ادا کرے جس کی تین صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ جس طرح کا جانور اس نے شکار کیا ہے اسی قبیل کا جانور گھریلو چوپایوں میں سے کفارہ کی قربانی کے لیے خانہ کعبہ بھیجے، اگر یہ متعذر ہو تو اس جانور کی قیمت کی نسبت سے مسکینوں کو کھانا کھلائے، اگر یہ اس کے لیے دشوار ہو تو آخری درجے میں اتنے روزے رکھ دے جتنے مسکینوں کا کھانا کھلانا اس پر عائد ہوتا ہے۔ رہا اس امر کا فیصلہ کہ شکار کردہ جانور کا مثل اور

بدل پالتو چوپایوں میں سے کون چوپایہ ہو سکتا ہے تو اس کا فیصلہ اور اس کے متعذر ہونے کی صورت میں اس کی قیمت یا مساکین یا روزوں کی تعداد کا فیصلہ تو یہ کام مسلمانوں میں سے دو ثقہ آدمی کریں گے تاکہ جرم کے مرتکب کے لیے اپنے نفس کی جانبداری کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔

قرآن کے الفاظ سے مجھے یہی بات قوی معلوم ہوتی ہے کہ کفارہ کے معاملے میں خطا اور عمد کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے۔ مجھے الفاظ قرآن کی روشنی میں سعید بن جبیر کا مذہب مضبوط معلوم ہوتا ہے جو خطا کی صورت میں کفارہ کے قائل نہیں۔ اس کی تائید میں ایک قول حضرت حسن کا بھی ہے۔ اسی طرح جو لوگ شکار کردہ جانور کی مثلیت کا فیصلہ بہر شکل قیمت ہی کے ذریعہ سے کرنے کے قائل ہیں، اس کے بعد وہ اختیار دے دیتے ہیں کہ چاہے کوئی شخص اس قیمت کے جانور کی قربانی کر دے، چاہے اس نسبت سے مسکینوں کو کھانا کھلا دے یا روزے رکھ دے تو یہ بات بھی کچھ زیادہ مضبوط نہیں معلوم ہوتی۔ جب واضح طور پر پالتو جانوروں میں شکار کے جانوروں کے بدل موجود ہیں مثلاً ہرن کی جگہ بکری، دنبہ، مینڈھا وغیرہ، نیل گاؤ اور گورخر کی جگہ گائے وغیرہ تو مثلیت کے فیصلہ کے لیے قیمت ہی کیوں معیار قرار پائے؟ شکار کردہ جانور کا بدل موجود نہ ہو تب تو بلاشبہ قیمت ہی اس کا بدل ہو سکتی ہے لیکن ہر حالت میں اسی کو معیار قرار دینا الفاظ قرآن کے خلاف ہے۔ یہ بات بھی کچھ زیادہ مضبوط نہیں معلوم ہوتی کہ کفارہ کی مذکورہ تینوں شکلوں کا کفارہ دینے والے کو یکساں اختیار ہے، چاہے روزے رکھ دے، چاہے مسکینوں کو کھانا کھلا دے، چاہے قربانی کرے بلکہ ان میں ترتیب معلوم ہوتی ہے۔ یہ بات کہ 'او' تخییر کے لئے آتا ہے اگرچہ صحیح ہے لیکن اگر قرینہ موجود ہو تو یہ ترتیب کو بھی مستلزم ہے جیسا کہ اسی سورہ کی آیت ۱۰۶ میں ہے۔ اس وجہ سے میں امام احمد اور زفر کے مذہب کو قوی سمجھتا ہوں جو یہاں ترتیب کے قائل ہیں۔

'وَمَنْ عَادَ فَیَنْتَقِمُ اللّٰہُ مِنْہُ' اسی طرح کی تنبیہ ہے جس طرح کی تنبیہ اوپر والی آیت میں 'فَمَنِ اعْتَدٰی بَعْدَ ذٰلِکَ فَلَہٗ عَذَابٌ اَلِیْمٌ' کے الفاظ میں وارد ہوئی ہے۔ یہ تنبیہ بہت سخت ہے اور اس سختی کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں کہ یہ اسی طرح کا امتحان ہے جس طرح کا امتحان سبت کے معاملے میں بنی اسرائیل کا ہوا اور جس میں فیل ہونے پر ان کو نہایت عبرت انگیز سزا ملی۔ یہ کفارہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ جو رکھا ہے تو یہ نافع اسی شکل میں ہے جب اس کے ساتھ مخلصانہ توبہ پائی جائے۔ اگر دل کا رجوع اس کے ساتھ شامل نہ ہو بلکہ آدمی یہ خیال کرکے نافرمانی کرتا رہے کہ گرفت ہوئی تو کفارہ دے لیں گے تو ایسے لوگ

خدا کی پکڑ سے نہیں بچ سکتے۔

أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ ۖ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ۔ الآیہ

بحری و بری شکار کے احکام میں فرق

مذکورہ بالا نہی سے جو شکار مستثنیٰ ہے، یہ اس کا بیان ہے۔ یہود کے لیے، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، سبت کے دن دریائی شکار ممنوع تھا، اس امت کے لئے حالت احرام میں خشکی کا شکار ممنوع ہوا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ فرق اس بنیاد پر ہو کہ اہل عرب کے لیے زیادہ کشش خشکی کے شکار میں تھی اور یہود کے لئے، ان کے جائے وقوع کے لحاظ سے، دریائی شکار میں۔ یہ ایک امتحان ہے اور امتحان میں اگر یہ پہلو ملحوظ ہو تو یہ اس کے مزاج سے مناسبت رکھنے والی بات ہے۔ 'صید' کا لفظ جس طرح 'غیر محلی الصید' میں مصدر کے معنی میں ہے چنانچہ وہاں 'واذا حللتم فاصطادوا' کہہ کر اس کے مصدری معنی میں ہونے کو واضح بھی کر دیا ہے اسی طرح ہمارے نزدیک یہاں بھی مصدری معنی میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں تک خشکی کا تعلق ہے اس کا شکار کرنا تو محرم کے لئے ممنوع ہے لیکن کسی غیر محرم کا کیا ہوا شکار کھانا، اگر کسی پہلو سے اس شکار میں اس کا کوئی دخل نہیں ہے، اس کے لئے ممنوع نہیں ہے۔ رہا دریا کا شکار تو اس کا شکار کرنا اور دوسرے کا کیا ہوا شکار کھانا دونوں محرم کے لیے جائز ہے۔ یہ رخصت، اللہ تعالیٰ نے اس لئے عطا فرمائی ہے کہ محرمین اور اہل قافلہ کو زاد راہ کے معاملے میں آسانی ہو۔ خشکی کے سفر میں اگر زاد راہ ختم ہو جائے تو اس کے حاصل کرنے کی راہیں کھلی ہوتی ہیں۔ دریائی سفر میں اگر یہ زحمت پیش آ جائے تو شکار کے سوا کوئی اور راہ باقی نہیں رہ جاتی۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ یہود کو جو شکار کی ممانعت تھی تو وہ صرف ہفتہ میں ایک دن کے لیے تھی۔ اس وجہ سے کسی ناقابل حل زحمت کے پیش آنے کا کوئی اندیشہ نہ تھا۔ اس امت کو یہ ممانعت پورے دوران احرام کے لیے ہوئی۔ دریائی سفر کرنے والے قافلوں کو بعض حالات میں ناقابل حل مشکل پیش آ سکتی تھی اس وجہ سے دریائی شکار کے معاملے میں یہ رعایت ہوئی۔

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَامًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَائِدَ ۚ ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَأَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ○ اعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ وَأَنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ○ مَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا تَكْتُمُونَ ○ قُل لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ

وَالطَّيِّبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيثِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۔ ۹۷ - ۱۰۰

شعائر کے احترام کی تاکید

اوپر والی بات، اصلاً شعائر الٰہی کے احترام سے تعلق رکھنے والی بات ہے۔ اس وجہ سے اس کے بعد دوسرے معروف شعائر۔ بیت اللہ، شہر حرام اور ہدی اور قلائد کی بھی یاد دہانی فرما دی کہ ان کے احترام سے متعلق بھی جو ہدایات دی گئی ہیں ان کو بھی حرز جاں بناؤ۔ کسی پہلو سے ان کی حرمت میں کوئی فرق نہ آنے۔ 'کعبہ' کی وضاحت 'بیت حرام' کے لفظ سے یہاں اسی پہلو کی طرف توجہ دلانے کے لیے کی گئی ہے کہ یہ خدا کا محترم ٹھہرایا ہوا گھر ہے، اس کے احترام کے حدود و قیود مقرر ہیں، ان حدود و قیود کی ہر حال میں نگہداشت رہے۔ 'قیاما للناس' پر سورہ بقرہ کی تفسیر میں 'مثابة للناس وامنا' کے تحت ہم تفصیل سے لکھ چکے ہیں کہ ذریت ابراہیمؑ کی تمام دینی، سیاسی اور معاشی شیرازہ بندی اسی گھر کی بدولت تھی، اور بعثت نبویؐ کے بعد یہی گھر ہے جو تمام امت کا قبلہ اور مرکز ہے۔ 'الشہر الحرام' سے مراد یہاں کوئی مخصوص مہینہ نہیں بلکہ تمام اشہر حرم کے لیے یہ بطور اسم جنس کے استعمال ہوا ہے، ان مہینوں کی دینی و دنیوی برکات پر ہم سورہ بقرہ کی تفسیر میں گفتگو کر چکے ہیں۔ ہدی اور قلائد کی وضاحت اسی سورہ کے آغاز میں ہو چکی ہے۔ ہمارے نزدیک تقدیر کلام یوں ہے۔ جعل اللہ الکعبۃ البیت الحرام قیاما للناس والشہر الحرام والہدی والقلائد شعائر۔ یعنی اللہ نے کعبہ بیت محترم کو لوگوں کے لیے مرکز اور شہر حرام، ہدی اور قلائد کو شعائر کا درجہ دیا۔ چونکہ یہ بات سیاق کلام سے بالکل واضح تھی اس وجہ سے لفظ شعائر کو حذف کر دیا۔

شعائر کی حکمت

'ذٰلک لتعلموا ان اللہ یعلم الآیہ'۔ ذٰلک کا اشارہ مذکورہ بالا شعائر کی طرف ہے۔ اور یہ حکمت بیان ہوئی ہے ان شعائر کے مقرر کئے جانے کی کہ اللہ نے یہ اس لیے مقرر فرمائے ہیں کہ تمہارے اندر خدا کے فعلاً و صفتاً علیم و خبیر ہونے کا عقیدہ پوری طرح واضح ہو جائے۔ ہم اوپر آیت ۹۴ 'لیعلم اللہ من یخافہ بالغیب' کے تحت اشارہ کر چکے ہیں کہ شعائر درحقیقت ابتلاء و امتحان کے لیے مقرر کئے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ سے امتحان کرتا ہے کہ کون اس سے غیب میں رہتے ڈرتے ہیں، کون نہیں ڈرتے۔ ظاہر ہے کہ اس امتحان میں پورے وہی اترتے ہیں اور وہی اتر سکتے ہیں جن کے اندر یہ علم راسخ ہوتا ہے کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب کو خدا جانتا ہے۔ جن کے اندر یہ عقیدہ پختہ ہوتا ہے وہی ہیں

جو غیب میں رہتے اس سے ڈرتے ہیں اور یہی غیب میں رہتے خدا سے ڈرنا تمام خشیت و تقویٰ اور سارے اسلام و ایمان کی روح ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کو فعلاً بھی بیان کیا ہے اور صفۃً بھی اس لئے کہ خدا کا علم ماضی، حاضر، مستقبل، ظاہر، باطن، غائب، موجود، مضمر سب پر محیط ہے اور انسان کا خدا کے علم کے متعلق یہی عقیدہ ہے جو اس کے اندر خشیت بالغیب پیدا کرتا ہے۔

تنبیہ اور بشارت

"اعلموا ان اللہ شدید العقاب و ان اللہ غفور الرحیم": یہ تنبیہ اور بشارت دونوں ساتھ ساتھ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ خدا سے بے خوف ہو کر اس کے شعائر کی بے حرمتی کریں گے اللہ ان کو سخت سزا دے گا اور جو لوگ غیب میں رہتے اس سے ڈرتے رہیں گے اور اس کے شعائر کا کما حقہٗ احترام کریں گے ان کے لیے وہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔

"ما علی الرسول الا البلاغ الایہ": یہ دوسری تنبیہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے رسول پر ذمہ داری صرف واضح طور پر ہماری ہدایات کو پہنچا دینے کی ہے۔ یہ فرض رسول نے ادا کر دیا۔ اب آگے ذمہ داری تمہاری ہے۔ تم مانو یا نہ مانو۔ مانو گے تو اس میں تمہاری ہی بھلائی ہے، نہ مانو گے تو اس کا انجام خود دیکھو گے۔ یاد رکھو کہ جو تم ظاہر کرتے ہو خدا اس کو بھی جانتا ہے اور جو چھپاتے ہو اس سے بھی باخبر ہے۔

کسی برائی کی کثرت اس کے جواز کی دلیل نہیں

"قل لا یستوی الخبیث والطیب ولو اعجبک کثرۃ الخبیث فاتقوا اللہ یا اولی الالباب لعلکم تفلحون" ۔ یہ بھی اسی سلسلے کی ایک تنبیہ ہے اور بہت بڑی تنبیہ ہے۔ خبیث اور طیب پر ہم دوسرے مقام میں بحث کر کے بتا چکے ہیں کہ ان کا اطلاق بُری اور اچھی اشیا پر بھی ہوتا ہے اور بُرے اور اچھے اشخاص پر بھی ہوتا ہے، اسی طرح ان اشیا پر بھی ہوتا ہے جو مادی اعتبار سے بُری اور اچھی ہوتی ہیں اور ان اشیاء پر بھی جو عقلی اور اخلاقی اعتبار سے اچھی اور بُری ہوتی ہیں۔ یہاں پیش نظر اشیاء اور اشخاص دونوں ہیں لیکن جہاں تک اچھائی اور برائی کا تعلق ہے وہ صرف اخلاقی پہلو سے زیر بحث ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کے نزدیک خیر اور شر، نیکی اور بدی، فسق اور تقویٰ، نیکو کار اور بدکار دونوں یکساں نہیں ہیں۔ خدا خیر مطلق اور سراپا حق و عدل ہے، اس وجہ سے وہ صرف خیر کو پسند کرتا ہے، شر کو پسند نہیں کرتا، وہ صرف طیب کو قبول فرمائے گا۔ خبیث کے لیے اس کے ہاں جہنم کی آگ کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ جو لوگ خدا کی نافرمانی اور اس کے شعائر کی توہین کر کے اپنے آپ کو خبیث بنا لیں گے، یاد رکھیں کہ خدا ان کو دوزخ

میں جھونک دے گا۔ فوز و فلاح صرف ان کو حاصل ہو گی جو خدا سے ڈرتے رہیں گے۔ اس کے احکام و شعائر کا احترام کریں گے اور اپنے آپ کو طیب و پاکیزہ بنائیں گے۔ گویا یہ اوپر والے مضمون ان اللہ شدید العقاب وان اللہ غفور الرحیم کی تکمیل ہے۔ اس کے بعد "ولو اعجبک کثرۃ الخبیث" کہہ کر اس راہ کے سب سے بڑے فتنہ سے آگاہ فرما دیا۔ وجہ یہ کہ بہت سے نادانوں کے لیے کسی برائی کی کثرت نہ صرف اس کی تقلید کے لیے محرک بلکہ اس کے جواز و استحسان کی ایک دلیل بن جاتی ہے۔ جو فتنہ عام ہو جاتا ہے اور جو بدی فیشن میں داخل ہو جاتی ہے "اپنے دروازے بھی اس کے لئے چوپٹ کھول دیتے ہیں۔ اول تو ان کا ضمیر اس سے کوئی انقباض محسوس نہیں کرتا، اور اگر شروع شروع میں کچھ محسوس کرتا بھی ہے تو وہ اس کو اس عقلی تسلی سے مطمئن کر لیتے ہیں کہ بھلا اس زمانے میں کوئی اپنے آپ کو اس چیز سے کس طرح الگ رکھ سکتا ہے؟" نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ مروّت کو حمام میں ننگا دیکھ کر وہ خود بھی ننگے ہو جاتے ہیں۔ اس طرح آہستہ آہستہ پورا معاشرہ ننگوں کا معاشرہ بن جاتا ہے اور پھر حالت یہ ہو جاتی ہے کہ شریف اور مہذب وہ نہیں کہلاتا جو کپڑے پہن کر نکلتا ہے بلکہ وہ کہلاتے ہیں جو اپنی عریانی کی نمائش کرتے یا کرتی ہیں۔ اگر ان سے ان کے اس رویہ کے جواز کی دلیل پوچھئے تو وہ اس کے حق میں جو سخن سازی بھی کریں اس کی تہ میں صرف یہ چیز نکلے گی کہ کیا کیا جائے، یہی زمانہ کا چلن اور یہی وقت کا فتویٰ ہے۔ یعنی اکثریت کا عمل ان کے لیے دلیل راہ بن جاتا ہے اور دانش فروشی کی تمام لن ترانیوں کے ساتھ جب ذریعہ سارا گلہ چل رہا ہوتا ہے وہ بھی اس پر چل پڑتے ہیں۔ قرآن کے الفاظ سے یہاں یہ بات صاف نکلتی ہے کہ اگرچہ کسی برائی کا غلبہ اور خبیث کی کثرت اپنے اندر کشش تو رکھتی ہے لیکن جو اس کشش سے مغلوب ہو کر اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیتے ہیں وہ سب سفہا اور حمقا میں داخل ہیں، اولوا الالباب اور اہل عقل وہ ہیں جو اس وبائے عام میں بھی اس کے اثرات سے محفوظ اور تقویٰ کی راہ پر گامزن رہتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں اس لیے کہ خدا کے ہاں نہ خبیث و طیب دونوں یکساں ہوں گے اور نہ خبیث اس لیے طیب بن جائے گا کہ اس کی مقدار بہت زیادہ ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَاِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِیْنَ یُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ ۝ قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِیْنَ (۱۰۱ - ۱۰۲)

یہ بھی برسرِ موقع ایک تنبیہ ہے۔ ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ اوپر اُن سوالوں کے جواب دیئے گئے ہیں جو ابتدائے سورہ میں بیان کردہ احکام سے متعلق پیدا ہوئے یا پیدا ہو سکتے تھے۔ اب یہ تنبیہ فرمائی کہ جو مفید سوال تھے ان کے جواب دے دیئے گئے۔ لیکن ایسے سوال نہ کرو جن کے جواب اگر دے دیئے جائیں تو تمہارے مزاج اور تمہاری خواہش کے خلاف پڑنے کے سبب سے وہ تمہیں برے لگیں گے۔ ساتھ ہی یہ حقیقت بھی واضح فرما دی کہ یہ زمانہ نزولِ قرآن کا زمانہ ہے۔ یہ زمانہ بارش کے ایام سے مشابہ ہے۔ بارش کے زمانہ میں جس طرح ہر بیج اُگ پڑتا ہے اسی طرح اس زمانے میں جو سوال بھی کرو گے اس کا جواب نازل ہو سکتا ہے۔ اس وجہ سے سوچ سمجھ کر وہی سوالات کرو جو دنیا اور آخرت میں تمہارے لیے نافع اور علمِ شریعت میں اضافہ کے موجب ہوں۔ غیر ضروری سوالات اٹھا کر اپنی پابندیوں میں اضافہ کی راہ نہ کھولو۔ خدا بخشنے والا اور بردبار ہے۔ اس وجہ سے اس نے تمہارے بے ضرورت سوالات نظر انداز کر دیئے ہیں۔ اگر ان کے بھی جواب دے دیئے جاتے تو ہو سکتا ہے کہ تم ان کو نباہ نہ پاتے اور اس طرح اپنے ہاتھوں اپنی راہ میں کانٹے بونے والے اور خدا کے غضب کو دعوت دینے والے بنتے۔

اس کے بعد بطور مثال ایک قوم کا حوالہ دیا ہے۔ مراد تو اس سے بالبداہت یہود ہیں لیکن ان کا نام نہیں لیا ہے بلکہ ان کا ذکر نکرہ کے ساتھ کیا ہے جس سے فی الجملہ اعراض اور نفرت کا اظہار ہوتا ہے۔ ان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ انہوں نے بھی اپنے نبی سے اسی طرح کے سوالات و مطالبات کیے لیکن جب ان کو جواب دے دیئے گئے تو وہ ان کے منکر بن بیٹھے۔ ان کے سوالوں کی نوعیت سورۂ بقرہ میں گائے کے قصہ سے واضح ہو چکی ہے اور پچھلی سورتوں میں یہ بات بھی ہم تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں کہ درحقیقت ان کے اس طرح کے سوالات تھے جن سے انہوں نے اپنی ان قیدوں اور پابندیوں میں اضافہ کر دیا جن کو قرآن نے 'اصر و اغلال' سے تعبیر فرمایا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس امت پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے کہ اس نے غیر ضروری سوالوں کو نظر انداز فرما کر ہمیں اصر و اغلال سے بچایا ہے اور ان معاملات کو ہمارے عقل و اجتہاد پر چھوڑ دیا جن میں ہماری عقل و فطرت ہماری رہنمائی کے لیے کافی ہے۔ اس میں یہ حکمت بھی تھی کہ یہ شریعت آخری اور کامل شریعت ہے، اس میں کوئی بات بھی معیار سے مختلف نہیں ہو سکتی، اس لیے کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں تھا جو اس کو معیار پر لاتا۔ اس کے برخلاف یہود کی شریعت ایک وقتی شریعت تھی، اس میں اگر اصر و اغلال تھے تو وہ، جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے، آخری پیغمبر کے ذریعہ سے دور ہو گئے۔

"قد سألہا" میں ضمیر کا مرجع مذکورہ سوال ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ انہوں نے بعینہٖ وہی سوالات کیے جن کی طرف اوپر اشارہ ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ اس نوعیت کے سوالات کیے۔ عربی میں ضمیروں کا استعمال اس طرح بھی ہوتا ہے۔ قرآن میں اس کی نظیریں موجود ہیں۔ ہم مناسب محل میں اس پر مفصل گفتگو کریں گے۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۭ وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـــًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۭ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۔ ۱۰۳-۱۰۵

اوپر آیت ۱۰۰ میں ان چیزوں کا ذکر ہوا ہے جن کو اللہ نے شعائر کا درجہ دے کر محترم قرار دیا ہے۔ اس کے بعد چند مناسب موقع تنبیہات آ گئیں۔ اب یہ اُن مشرکانہ چیزوں کا ذکر ہو رہا ہے جن کو مشرکین نے شعائر کا درجہ دے کر مذہبی تقدس کا جامہ پہنا رکھا تھا، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں میں سے کسی چیز کو بھی مشروع نہیں کیا تھا۔ مشرکین نے محض من گھڑت طور پر ان کو ایجاد کیا، ان کے احترام کی روایت قائم کی اور پھر اپنی ان بدعات کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیا کہ اس نے ان کے احترام کا حکم دیا ہے۔ گویا مشروع کے بیان کے بعد اس کے مقابل کی غیر مشروع چیزوں کا بھی ذکر فرما دیا تاکہ مسلمان ان سے اجتناب کریں۔

'ما جعل اللہ'، 'جعل' یہاں مشروع کرنے کے معنی میں ہے۔ یعنی اللہ نے یہ چیزیں مشروع نہیں فرمائی ہیں۔

'بحیرۃ'، اس اونٹنی کو کہتے ہیں جس سے پانچ بچے پیدا ہو چکے ہوتے اور ان میں آخری نر ہوتا۔ ایسی اونٹنی کے کان چیر کر اس کو آزاد چھوڑ دیتے، نہ اس پر سواری کرتے نہ اس کا دودھ دوہتے۔

'سائبہ'، اس اونٹنی کو کہتے جس کے متعلق اس کا مالک اپنی کسی بیماری میں یہ منت مانتا کہ اگر اس کو شفا ہو گئی تو وہ اس کو آزاد چھوڑ دے گا، نہ اس پر سواری کرے گا نہ اس کا دودھ دوہے گا۔

وصیلہ: بکری اگر مادہ جنتی تو اس کو اپنا حصہ سمجھتے، نر جنتی تو اس کو اپنے معبودوں کا حصہ سمجھتے اور اگر نر و مادہ دونوں ایک ساتھ جنتی تو اس کو وصیلہ کہتے اور ایسے نر کو بتوں کی نذر کے قابل نہ سمجھتے۔

حام: اس سانڈ اونٹ کو کہتے جس کی صلب سے کئی پشتیں پیدا ہو چکی ہوتیں۔ ایسے سانڈ کو بھی آزاد چھوڑ دیتے، نہ اس پر سواری کرتے، نہ بوجھ لادتے۔

یہ سب عرب جاہلیت کی نذریں اور منتیں تھیں۔ اس قسم کے جانور آزاد چھوٹے پھرتے، جس گھاٹ سے چاہتے پانی پیتے اور جس کی چراگاہ میں چاہتے چرتے۔ نہ ان کو کوئی روک سکتا، نہ چھیڑ سکتا۔ ان کو مذہبی تقدس کا ایسا درجہ حاصل تھا کہ ہر شخص ان کے چھیڑنے کے وبال سے لرزہ براندام رہتا۔ قرآن نے واضح فرما دیا کہ ان کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔ شرعی حیثیت صرف ہدی اور قلائد کی ہے۔ یہ چیزیں صرف اوہام کی ایجاد ہیں، ان کو شریعت کی طرف منسوب کرنا اللہ اور اس کی شریعت پر صریح اتہام ہے۔ جو لوگ عقل سے عاری ہیں انہوں نے ان احمقانہ چیزوں کو اللہ سے نسبت دے رکھی ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ الآیہ: اوپر والی آیت میں یہ جو فرمایا ہے کہ وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ (ان میں سے اکثر نا سمجھ ہیں) یہ اسی کی دلیل بیان ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ ان لایعنی باتوں کو چھوڑ کر اللہ کی اتاری ہوئی کتاب اور رسول کے بتائے ہوئے طریقہ کی طرف آؤ تو بڑے غرّے کے ساتھ جواب دیتے ہیں کہ حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا، ہم نے اپنے باپ دادا کو جس طریقے پر پایا ہے ہمارے لئے وہی کافی ہے۔ فرمایا کہ کیا اس صورت میں بھی وہ باپ دادا ہی کی روایت کو حجت بنائیں گے جب کہ ان کے باپ دادا کو نہ تو کچھ علم رہا ہو اور نہ وہ ہدایت کی راہ پر رہے ہوں! یعنی کسی طریقہ کی صحت کی دلیل مجرد یہ چیز تو نہیں بن سکتی کہ وہ باپ دادا سے چلا آ رہا ہے، اس کے متعلق یہ معلوم کرنا بھی تو ضروری ہے کہ باپ دادا نے اس کو کسی علم اور کسی دلیل پر اختیار کیا تھا یا یوں ہی اختیار کر لیا تھا۔ اگر یہ تمیز غیر ضروری ہو جائے تو پھر تو عقل جو انسانیت کا وصف امتیازی ہے، بالکل فالتو چیز بن کے رہ جائے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۭ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۔ اوپر آیت ۹۹ میں جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی تھی کہ رسول کی ذمہ داری صرف واضح طور پر حق پہنچا دینے کی ہے، اس کو قبول کرنا یا نہ کرنا لوگوں کی اپنی ذمہ داری ہے۔ جو لوگ قبول نہ کریں گے اس کی پرسش خود ان سے

ہونی ہے نہ کہ رسول سے۔ اسی طرح اس آیت میں مسلمانوں کو تسلی دی ہے کہ جو لوگ اپنی عقل بیچ کر باپ دادا کی اندھی تقلید پر اڑ گئے ہیں ان کو ان کے حال پر چھوڑو۔ تم نے کلمۂ حق پہنچا دیا، اگر وہ نہیں مانتے تو اپنا بگاڑیں گے، تمہارا کچھ نہیں بگاڑیں گے۔ جو گمراہی کی راہ اختیار کرتا ہے وہ خود اپنی ہرزہ گردی کا انجام دیکھتا ہے۔ اس سے صحیح راہ بتانے والے کا کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ تم نے ان کو سنبھالنے کی کوشش کر دی، اگر وہ نہیں سنبھلتے تو تم اپنی فکر کرو، ان کے غم میں پریشان نہ ہو۔ یہ مضمون قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوا ہے۔ انعام کی آیات ۱۵، ۴۸، ۵۱، ۵۲، ۶۹ کے تحت ہم اس پر مزید بحث کریں گے۔

بعض لوگوں کو اس سے یہ شبہ ہوا کہ مسلمانوں کو دوسروں کی ہدایت و ضلالت سے کوئی سروکار نہیں ہے، انہیں بس اپنے نفس کی فکر کرنی چاہیئے۔ لیکن یہ خیال قطع نظر اس سے کہ مسلمانوں کے فریضۂ منصبی ــ شہادت علی الناس ــ کے خلاف ہے، خود اس آیت سے بھی بالکل بے جوڑ ہے۔ اس آیت سے جو بات نکلتی ہے وہ تو یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح آپ کے صحابہؓ بھی کفار کی حق بیزاری دیکھ کر کبھی کبھی یہ خیال فرمانے لگتے کہ کہیں یہ چیز اس امر کا نتیجہ نہ ہو کہ جو فرض ابلاغ ان پر عائد ہوتا ہے اس میں کوئی کوتاہی ہو رہی ہو۔ اس پر اللہ تعالےٰ نے جس طرح پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے اسی طرح صحابہؓ کو بھی تسلی دی کہ اس میں قصور تمہارا نہیں بلکہ یہ ان کے اپنے مزاج کا فساد ہے، تم نے اپنا فرض بخوبی انجام دے دیا، اب ان کے کفر و ایمان کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے، اس باب میں کوئی پرسش تم سے نہیں ہونی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ ۭ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ ۙ اللّٰهِ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ ۔ ۱۰۶

یہ بھی ایک تکمیلی و اتمامی حکم ہے جس کی نوعیت ابتدائے سورہ میں بیان کردہ بعض احکام کی وضاحت کی ہے۔ سورہ کے شروع، آیت ۸ میں، مسلمانوں کو ہدایت ہوئی ہے کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَاۗءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَـنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓي اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۸۔ وہاں، جیسا کہ ہم اس آیت کی

تفسیر میں بیان کر چکے ہیں اس عمومی شہادت کا بیان ہے جس کی ذمہ داری اس امت پر تمام خلق سے متعلق ڈالی گئی ہے۔ اب یہ اس شہادت کا مسلمانوں کے آپس کے ایک جزوی معاملہ میں بیان کر کے اس باب کی گویا تکمیل فرمائی ہے اور اس آیت کو اس شہادت کبریٰ کے بیان کے ساتھ جوڑ دیا ہے جس کا ذکر آیت ۱۰۵ میں آ رہا ہے اور جو اس عظیم سورہ کا آخری مضمون ہے جس پر یہ سورہ ختم ہوئی ہے۔ اس آیت کا اس مقام میں جگہ پانا ایک تو اس حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے کہ جب اس تکمیل حکم پر میثاق لے لیا گیا تو گویا تمام ابواب شہادت پر میثاق لے لیا گیا، دوسرا اس امر کو ظاہر کر رہا ہے کہ ہر چند یہ حکم ایک جزوی حکم ہے لیکن باعتبار اپنی اصل کے یہ بھی اسی شہادت کبریٰ کا ایک جزو ہے جس پر انبیاء علیہم السلام مامور ہوئے، اور جس کو انہوں نے اس دنیا میں بھی انجام دیا اور جس کے لیے اللہ تعالیٰ انہیں آخرت میں بھی کھڑا کرے گا۔

۱۰۶ 'یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَیْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ
حِیْنَ الْوَصِیَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ'۔ 'اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ'
اور 'حِیْنَ الْوَصِیَّةِ' یہ دونوں ظرف 'شَهَادَةُ بَیْنِكُمْ' سے تعلق رکھتے ہیں اور 'اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ' اسی طرح کی ترکیب ہے جس طرح 'وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ' ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کی موت کا وقت آ جائے اور اسے اپنے مال سے متعلق کوئی وصیت بھی کرنی ہے تو اس کے لیے وہ مسلمانوں میں سے دو ثقہ آدمیوں کو گواہ بنائے۔

'اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَیْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِیْبَةُ الْمَوْتِ'۔ اگر کوئی شخص سفر میں ہے اور سفر ہی میں اس کو موت کا مرحلہ پیش آ جاتا ہے اور گواہ بنانے کے لیے اسے دو مسلمان نہیں مل رہے ہیں تو بدرجہ مجبوری غیر مسلموں ہی میں سے دو آدمیوں کو گواہ بنا سکتا ہے۔

'تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَیُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِیْ بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰی وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللّٰهِ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِیْنَ'۔ یہ ہدایت اصل حکم 'اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ' سے متعلق ہے۔ یعنی اپنوں میں سے جن دو معتبر گواہوں کو گواہی کے لیے منتخب کرو، اگر اندیشہ ہو کہ وہ اپنی گواہی کسی کی جانب داری میں کہیں بدل نہ دیں تو اس کو مؤکد کرنے کے لیے یہ تدبیر کر سکتے ہو کہ کسی نماز کے بعد مسجد میں انہیں روک لو اور ان سے اللہ کے نام پر قسم لو کہ وہ اپنی گواہی کسی نفع دنیوی کی خاطر اور کسی کی جانبداری میں، خواہ وہ ان کا عزیز ہی کیوں نہ ہو، بدلیں گے نہیں اور اگر وہ اس کو بدلیں تو وہ گنہگار ٹھہریں۔

'مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ' میں 'صلوٰۃ' سے مراد کوئی مخصوص نماز نہیں بلکہ یہ لفظ اسم جنس کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ جس نماز کے بعد بھی وصیت کرنے والے کو موقع میسر آ جائے، یہ کام کر سکتا ہے۔ نماز کی قید کا فائدہ یہ ہے کہ جو قول و قرار اور جو شہادت و قسم نماز کے بعد اور مسجد میں نمازیوں کی موجودگی میں انجام پائے، ایک صاحب ایمان سے توقع یہی کی جاتی ہے کہ وہ اس پر مضبوطی سے قائم رہے گا، کسی ترغیب و تحریص سے اس کو بدلے گا نہیں۔ چنانچہ قسموں اور معاہدوں کے باب میں زمانۂ قدیم سے یہ رواج رہا ہے کہ ان کی تکمیل بالعموم معبدوں کے سامنے ہوتی۔ چونکہ اس چیز کی اثر انگیزی ایک فطری چیز ہے اس وجہ سے اسلام نے بھی اس کو اہمیت دی ہے۔ یہاں ایک شرط بھی مذکور ہے، وہ یہ کہ اگر گواہوں کے بارے میں کوئی شک ہو، تب یہ قسم لی جائے۔ اگر کوئی اندیشہ نہ ہو، گواہ ثقاہت و عدالت کے اعتبار سے ایسے مرتبے کے ہوں کہ ان کے بارے میں کسی سوءِ ظن کا احتمال نہیں ہے تو خواہ مخواہ ان سے قسم لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ 'وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللّٰهِ' میں اس گواہی کو 'شہادۃ اللہ' سے تعبیر کر کے اس کی عظمت واضح فرمائی ہے اس لیے کہ مومن کی ہر گواہی، چھوٹی ہو یا بڑی 'كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ' ۲
کی رو سے اس عظیم فریضہ منصبی کا ایک جزو ہے جس پر اللہ نے اس کو مامور فرمایا ہے، اگر اس میں ادنیٰ خیانت بھی اس سے صادر ہو تو وہ صرف بندوں ہی کا خائن نہیں بنتا ہے بلکہ اپنے رب کا بھی خائن بن جاتا ہے۔

ہم نے اس قسم کو اصل حکم یعنی اس صورت سے متعلق مانا ہے جب گواہ اپنوں۔ مسلمانوں۔ میں سے ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غیر مسلموں کے لیے نماز، مسجد، اللہ کے نام پر قسم اور وہ بھی ان الفاظ میں کہ 'وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللّٰهِ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِیْنَ' (ہم اس شہادت الٰہی کو چھپائیں گے نہیں، اگر ہم ایسا کریں تو ہم گنہگاروں میں سے ٹھہریں) بالکل غیر مؤثر چیزیں ہیں۔ اول تو وہ اپنے مذہبی جذبات کے خلاف ان باتوں کو گوارا ہی کیوں کریں گے اور کر بھی لیں تو اس کا اثر ان پر کیا ہوگا؟ ان کی گواہی تو ایک مجبوری کی صورت میں گوارا کی گئی ہے اور ایک شاذ حالت سے متعلق ہے۔ اس وجہ سے ان کی گواہی کی حفاظت کے لیے یہ اہتمام ایک بالکل بے جوڑ سی چیز ہے۔

'فَاِنْ عُثِرَ عَلٰۤی اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّاۤ اِثْمًا فَاٰخَرٰنِ یَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِیْنَ اسْتَحَقَّ عَلَیْهِمُ الْاَوْلَیٰنِ فَیُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَاۤ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَمَا اعْتَدَیْنَاۤ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ'۔ ۱۰۷

'عثر عثرا وعثورا علی السر' کے معنی ہیں وہ راز سے آگاہ ہوا۔

'الاولیان'۔ 'اولیٰ' کا مثنیٰ ہے جس کے معنی احق کے ہیں۔ (ان اولی الناس بابراھیم)

"الاولیان" یعنی الاولیان بالشہادۃ، شہادت کے زیادہ حق دار۔ ان سے مراد وہ دونوں گواہ ہیں جو وصیت کے ابتدائی گواہ بنائے گئے۔ چونکہ اپنے منصب کے اعتبار سے گواہی کے اصل حقدار وہی ہیں اس وجہ سے ان کو "الاولیان" کے لفظ سے تعبیر فرمایا۔ یہاں اس میں اس بات کی طرف اشارہ بھی ہے کہ جب وہ اولی بالشہادۃ ہیں تو انہیں چاہیے کہ وہ اپنے اس منصب کی لاج رکھیں اور کسی ایسی بدعنوانی کے مرتکب نہ ہوں کہ اولی بالشہادۃ ہوتے ہوئے بھی ان کی شہادت دوسروں کی قسم سے باطل ہو جائے۔

یہ ان گواہوں پر ایک مزید احتساب اور چیک (check) ہے۔ فرمایا کہ اگر یہ بات علم میں آئے کہ انہوں نے وصیت کرنے والے کی وصیت کے خلاف کسی کی جانب داری یا کسی کی حق تلفی کی ہے تو جن کی حق تلفی ہوئی ہے ان میں سے دو آدمی اٹھ کر قسم کھائیں گے کہ ہماری گواہی ان دونوں اولی بالشہادت گواہوں کی گواہی سے زیادہ سچی ہے، ہم نے ذرا بھی حق سے تجاوز نہیں کیا ہے، اگر ہم نے ایسا کیا ہو تو ہم ظالموں میں سے ٹھہریں۔

ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَاۤ اَوْ يَخَافُوْۤا اَنْ تُرَدَّ اَيْمَانٌۢ بَعْدَ اَيْمَانِهِمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ۔ ۱۰۸

یہ اس احتساب کا فائدہ بتایا ہے کہ اقرب ہے کہ اس احتساب کے خیال سے وہ ٹھیک ٹھیک گواہی دیں ورنہ انہیں ڈر ہوگا کہ اگر ان سے کوئی بے عنوانی صادر ہوئی تو ان کی قسمیں دوسروں کی قسموں سے باطل ہو جائیں گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ جن کی حق تلفی ہوئی ہے اگر وہ مذکورہ قسم کھا لیں گے تو وصیت کے اصل گواہوں کی گواہی ان کے اولی بالشہادت ہونے کے باوجود رد ہو جائے گی۔ "ترد ایمان بعد ایمانکم" میں "ایمان" کی تنکیر اسی طرح کی ہے جس طرح نطس وجوھ میں ہے جس پر گفتگو ہو چکی۔

"واتقوا اللہ واسمعوا واللہ لایھدی القوم الفسقین" یعنی اللہ سے ڈرو، پیغمبر کی بات مانو، جو اللہ سے نہیں ڈرتے اور پیغمبر کی بات نہیں سنتے وہ نافرمان ہیں اور اللہ ایسے نافرمانوں کو راہ یاب نہیں کرے گا۔ وہ دنیا میں بھٹکتے رہیں گے اور آخرت میں اپنے انجام بد سے دوچار ہوں گے۔

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَاۤ اُجِبْتُمْ ؕ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ۔ ۱۰۹

یہاں سے اس سورہ کا بالکل آخری ٹکڑا شروع ہو رہا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت

کے دن تمام انبیاء کو جمع کر کے ان سے پوچھے گا کہ انہوں نے اپنی اپنی امتوں کو کیا تعلیم دی تھی اور ان کی امتوں نے اس تعلیم کے باب میں کیا رویہ اختیار کیا؟ یہ سورہ کے آخر میں گویا اس حقیقت کی یاد دہانی ہے کہ میثاق الٰہی کی ذمہ داری نبی اور امت دونوں پر عاید ہوتی ہے اور قیامت کے دن اس کے بارے میں دونوں سے سوال ہوگا۔ آگے ذکر اگرچہ صرف سیدنا مسیحؑ سے سوال و جواب کا ہے لیکن آنجنابؑ کا ذکر بطور مثال ہے۔ اس مثال سے یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ اسی طرح کے سوال و جواب ہر نبی سے اس کی امت کے بارے میں ہوں گے اور اللہ تعالیٰ ہر امت پر اس کے نبی کی موجودگی میں واضح فرما دے گا کہ اس نے اللہ کے عہد کے معاملے میں اپنے نبی کی تعلیم کی کیا کیا خلاف ورزیاں کی ہیں۔ مثال کے طور پر سیدنا مسیحؑ کے انتخاب کی حکمت یہ ہے کہ وہ اسرائیلی سلسلۂ نبوت کی آخری کڑی ہیں۔ ان کی شہادت یہود و نصاریٰ کے لیے بھی سبق آموز ہو سکتی تھی اور اس امت کے لیے بھی۔ آنحضرتؐ کی شہادت اس مرحلہ میں اس لیے ذکر نہیں کی گئی کہ آپ کی امت ابھی دور تشکیل میں تھی۔ اس کا پورا کردار ابھی سامنے نہیں آیا تھا۔

"ماذا اجبتم" سوال کا صحیح مفہوم موقع و محل سے واضح ہوتا ہے۔ انبیاء سے یہ سوال جو یہاں مذکور ہے ان کے منکروں سے متعلق نہیں کیا جائے گا بلکہ جیسا کہ واضح ہوا ان کی امتوں سے متعلق کیا جائے گا کہ جن لوگوں کو تم نے اللہ کے عہد و میثاق میں داخل کیا ان کا رویہ اور ردعمل کیا رہا؟ انبیاء علیہم السلام پر سوال کی یہ حقیقت چونکہ واضح ہوگی اس وجہ سے وہ اپنی لاعلمی کا اظہار کریں گے کیونکہ ان کا علم صرف دنیا میں اپنی موجودگی کے زمانے تک ہی محدود ہوگا اور اس سوال کے صحیح جواب کا انحصار اس امر پر ہے کہ انہیں اپنی امتوں کی بعد کی تبدیلیوں کا بھی علم ہو۔ چونکہ بعد کی تبدیلیوں کا انہیں علم نہیں ہوگا اس وجہ سے وہ اس جواب کے معاملے کو خدا ہی کی طرف تفویض کریں گے۔ آگے حضرت عیسیٰؑ کا ارشاد مذکور ہے۔ "کنت علیھم شھیدا ما دمت فیھم فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیھم وانت علی کل شیئ شھید" (میں جب تک ان میں رہا ان پر گواہ رہا پھر جب تو نے مجھے اٹھا لیا تو تو ان پر نگران رہا اور تو ہر چیز پر نگراں ہے)

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِىْ عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۗ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِى الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۚ وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِىْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًاۢ بِاِذْنِىْ وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِىْ ۚ وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِىْ ۚ وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِىْۤ اِسْرَاۤءِيْلَ

عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ - ۱۱۰

یہاں حضرت عیسیٰؑ کے جو معجزات مذکور ہیں یہ سب سورہ آل عمران میں بھی بیان ہو چکے ہیں وہاں ہم ان کی وضاحت کر چکے ہیں۔

'وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ' سے اشارہ بنی اسرائیل کی ان سازشوں اور چالوں کی طرف ہے جو انہوں نے سیدنا مسیحؑ کے قتل اور سولی کے لیے کیں۔

یہ تمام باتیں قیامت کے دن حضرت عیسیٰؑ کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ نصاریٰ پر حجت تمام کرنے کے لیے فرمائے گا۔ گویا حضرت عیسیٰؑ کی موجودگی میں نصاریٰ پر یہ حقیقت واضح کر دی جائے گی کہ حضرت عیسیٰؑ اور ان کی والدہ پر جو انعام بھی ہوا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا، انہوں نے جو معجزے بھی دکھائے سب اللہ کے اذن و حکم سے دکھائے اور یہودیوں نے ان کو جن خطرات میں ڈالا ان سے ان کو اللہ تعالیٰ ہی نے نکالا۔ پھر جب یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ نے کیا اور اس کے سب سے بڑے گواہ خود عیسیٰؑ ہیں تو نصاریٰ بتائیں کہ انہوں نے کس کے کہنے سے ان کو خدا بنا ڈالا۔ یہاں 'باذنی' (میرے حکم سے) کی تکرار نہایت بلیغ ہے۔ ایک ایک بات پر اللہ تعالیٰ اس کو دہرائے گا اور ان میں سے ہر بات پر سیدنا مسیحؑ آمنا و صدقنا ہی کہیں گے تو ظاہر ہے کہ جن معجزات کے بل پر نصاریٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو خدا بنایا جب وہ سب خدا کے 'اذن' سے ہوئے اور اس کا اعتراف خود معجزات کا دکھانے والا ہی کرے گا تو نصاریٰ کے حصے میں فضیحت اور رسوائی کے سوا اور کیا باقی رہ جائے گا۔

وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ ۚ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ۝ اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ۭ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ۚ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝ قَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّىْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ - ۱۱۱ - ۱۱۵

'وحی' کا لفظ یہاں اصطلاحی معنی میں نہیں، بلکہ لغوی معنی میں ہے۔ یعنی دل میں کوئی ارادہ ڈالنا۔

'حواری' کے لفظ پر دوسرے مقام میں بحث ہو چکی ہے۔ یہی حواریین تھے جو پوری قوم کے اندر سے حضرت عیسیٰؑ پر ایمان لائے، انہی نے دعوت کے کام میں آپ کی مدد کی اور انہی کو آنجنابؑ کے خلف کی حیثیت حاصل ہوئی۔ ان کی اسی اہمیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کے سامنے بھی وہ حقائق پیش کرے گا جن سے نصاریٰ پر حجت پوری ہو گی۔ اس اتمام حجت کے چند پہلو یہاں ذکر کیے جاتے ہیں۔

ایک یہ کہ حواریین نے جس دین کو قبول کیا وہ نصرانیت و مجوسیت نہیں بلکہ اسلام ہے۔

دوسرا یہ کہ حواریین حضرت عیسیٰؑ کو 'عیسیٰ ابن مریم' کہتے تھے، ان کی الوہیت کا کوئی تصور ان کے ذہن میں نہیں تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ ہی کو حضرت عیسیٰ اور تمام کائنات کا رب مانتے تھے۔

تیسرا یہ کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کو بالذات معجزات کا دکھانے والا نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کو صرف ان کے ظہور کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے، چنانچہ انہوں نے مائدہ کے اتارے جانے کے لیے جو درخواست کی وہ حضرت عیسیٰؑ سے نہیں کی کہ آپ ہمارے لیے مائدہ اتاریں بلکہ یہ درخواست کی کہ اگر یہ بات آپ کے خداوند کی حکمت کے خلاف نہ ہو تو آپ اس سے درخواست کیجیے کہ وہ ہمارے لیے مائدہ اتارے تاکہ اس سے ہمارے دلوں کو طمانیت حاصل ہو۔

جب یہ ساری باتیں سیدنا مسیحؑ، حواریین اور نصاریٰ کی موجودگی میں سامنے آئیں گی تو اس وقت وہ سارے جھوٹ آشکارا ہو جائیں گے جو مسیحیوں نے حضرت مسیحؑ یا حواریین پر باندھے ہیں اور جن کے ذریعہ سے اپنی بدعات میں اُن کو ملوث کیا ہے۔

'هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ' کے سوال کے باب میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ حواریین کا سوال خدا کی قدرت سے متعلق نہیں بلکہ اس کی حکمت سے متعلق تھا کہ اس قسم کی کوئی نشانی دکھانا اس کی حکمت کے مطابق بھی ہو گا یا نہیں؟ حواریین باایمان لوگ تھے، وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتے تھے کہ ان کی یہ درخواست مشابہ ہے اس مطالبہ سے جو بنی اسرائیل نے خدا کو دیکھنے کے لیے کیا تھا جس کے نتیجہ میں ان کو کڑک نے آ دبوچا تھا۔ معجزات ہرچند خارق عادت ہوتے ہیں تاہم وہ اسباب کے پردے ہی میں ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ تمام پردے اٹھا دیے جائیں۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس طرح کے مطالبات کی کبھی حوصلہ افزائی نہیں فرمائی جن میں خواہش ان حدود سے متجاوز ہو جائے جو معجزات کے ظہور کے لیے سنت اللہ میں مقرر ہیں۔ چنانچہ حضرت مسیحؑ نے بھی اس سے روکا اور جب حواریین کی دوبارہ درخواست پر اس کے لیے درخواست فرمائی تو اللہ تعالیٰ نے اس درخواست کو پسند نہیں فرمایا بلکہ ارشاد ہوا کہ اتارنے کو تو میں مائدہ اتار دوں گا لیکن یاد رکھو کہ جو لوگ اتنی کھلی نشانی دیکھنے کے بعد کفر میں مبتلا ہوں گے ان کو سزا بھی وہ دوں گا جو کسی اور کو نہ دوں گا۔ معلوم ہوتا ہے اس کے بعد حواریین اپنی اس درخواست سے باز آئے

اہل تاویل میں سے بھی ایک گروہ کا یہی خیال ہے کہ اس کا نزول نہیں ہوا۔ انجیلوں میں بھی اس کا ذکر نہیں ہے۔

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَ
اُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا یَكُوْنُ لِیْ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ
بِحَقٍّ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَلَا اَعْلَمُ مَا فِیْ
نَفْسِكَ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ۝ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَا اَمَرْتَنِیْ بِهٖ
اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبَّكُمْ وَكُنْتُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْهِمْ
فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْهِمْ وَاَنْتَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ ۝
اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝ ۱۱۶-۱۱۸

'واذ قال اللہ الآیۃ' اوپر جو باتیں مذکور ہوئی ہیں مقصود ان کے ذکر سے بھی اگرچہ جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، نصاریٰ کی تفضیح ہے لیکن وہ تفضیح بالواسطہ ہے۔ اب یہ اس سوال کا ذکر آ رہا ہے جو اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰؑ سے نصاریٰ کی اصل گمراہی کے بارے میں پوچھے گا کہ کیا تم نے نصاریٰ کو یہ تعلیم دی تھی کہ اللہ کے سوا مجھ کو اور میری ماں کو بھی معبود بناؤ۔ حضرت عیسیٰؑ جواب میں فرمائیں گے کہ بھلا میں ایسی بات زبان سے کس طرح نکال سکتا تھا جس کا مجھے کوئی حق نہیں تھا، نہ تو تو نے یہ کہنے کا مجھے مجاز کیا تھا، نہ دنیا کی خلق و تدبیر میں میری کوئی حصہ داری تھی کہ میں اس کا مدعی بنتا! مقصود اس سوال و جواب سے یہ ہوگا کہ نصاریٰ، جنہوں نے حضرت مسیحؑ اور ان کی والدہ کو خدا کا شریک بنایا، بھرے مجمع میں پوری طرح رسوا ہوں۔

'ان اعبدوا اللہ ربی وربکم' کے ٹکڑے پر آل عمران کی تفسیر میں ہم گفتگو کر چکے ہیں کہ یہ دراصل صحیح تعبیر ہے سیدنا مسیحؑ کے ارشاد "میرا باپ اور تمہارا باپ" کی۔ اس کو وہیں دیکھیے۔

'وکنت علیہم شہیدا ما دمت فیہم' 'شہید' یہاں نگران کے معنی میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں جب تک ان میں موجود رہا، اس وقت تک تو میں دیکھتا رہا کہ وہ کیا بنا رہے ہیں۔ لیکن جب تو نے مجھے اٹھا لیا تو مجھے کچھ پتہ نہیں کہ انہوں نے کیا بنایا اور کیا بگاڑا ۔۔۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ 'ماذا اجبتم' کے سوال کا یہی پہلو ہے جس کی بنا پر انبیاء علیہم السلام اپنی لاعلمی کا اظہار فرمائیں گے۔

'ان تعذبہم فانہم عبادک الآیۃ' سیدنا مسیحؑ کے اس فقرے کی بلاغت کی تعبیر نہیں ہو سکتی۔ بظاہر دل چاہتا ہے کہ فقرہ یوں ہوتا۔ ان تغفرلہم فانہم عبادک وان تعذبہم فانک انت العزیز الحکیم " لیکن اگر یوں ہوتا تو یہ نہایت واضح الفاظ میں نصاریٰ کے لیے شفاعت بن جاتا اور انبیاء علیہم السلام کے متعلق یہ معلوم ہے کہ وہ مشرکین کے لیے سفارش نہیں فرمائیں گے۔ اس

وجہ سے سیدنا مسیحؑ بات ایسے اسلوب میں فرمائیں گے کہ بات سچی بھی ہو اور بارِ الٰہی کے شایان شان بھی ہو، دردمندانہ بھی ہو اور ان پر اس سے مشرکین و محرفین دین کی سفارش کی کوئی ذمہ داری بھی عائد نہ ہو۔ چنانچہ ان تعذبہم فانہم عبادک وان تغفرلہم فانک انت العزیز الحکیم کے الفاظ پر غور فرمائیے تو معلوم ہوگا کہ اس فقرے میں وہ تمام خوبیاں بھی موجود ہیں جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا اور ساتھ ہی یہ پہلو بھی موجود ہے کہ سیدنا مسیحؑ اپنے آپ کو ان کی شفاعت کی ذمہ داری سے بری کر لیں گے۔

قَالَ اللّٰهُ هٰذَا یَوْمُ یَنْفَعُ الصّٰدِقِیْنَ صِدْقُهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا اَبَدًا رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ذٰلِكَ الْفَوْزُ
الْعَظِیْمُ ۝ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِیْهِنَّ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ ۱۱۹-۱۲۰

'صدق' کے لفظ پر ہم آل عمران آیت ... کی تفسیر میں بحث کر چکے ہیں۔ یہاں 'صادقین' سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ سے اپنے قول و قرار اور عہد و میثاق میں پورے راست باز ثابت ہوئے، اس میں انہوں نے کوئی تبدیلی اور تحریف نہیں کی، زندگی کے تمام نشیب و فراز میں عزم و جزم کے ساتھ اللہ کی شریعت پر قائم رہے۔ من المومنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ (اور مومنین میں وہ مردان کار بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے باندھے ہوئے عہد کو سچ کر دکھایا)

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ آج کا دن تو راستبازوں کی فتح مندیوں اور کامرانیوں کے ظہور کا دن ہے۔ بدعہدوں، خائنوں اور جھوٹی آرزوؤں میں زندگی گزارنے والوں کے لئے آج حسرت و نامرادی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ جنہوں نے اللہ کے ساتھ اپنے عہد اخلاص و سچائی کے ساتھ پورے کئے ہیں ان کے لئے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ یعنی ان کے رب نے جو کچھ ان سے چاہا انہوں نے اس کی رضا کے مطابق وہ پورا کر دکھایا اور انہوں نے اپنے رب سے جو امیدیں کیں ان کی توقعات اور ان کے تصورات سے ہزاروں لاکھوں درجہ اوپر وہ پوری ہو گئیں۔ فرمایا کہ اصل بڑی کامیابی یہی ہے۔ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے اندر ہے سب کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

یہ اس سورہ کی تفسیر کی آخری سطریں ہیں جو سپرد قرطاس ہوئیں۔

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

پیر ۲۸ رمضان المبارک ۱۳۸۸ھ
۱۶ دسمبر ۱۹۶۸ء

ہے حال صاحب دلِ زندہ و بیدار کا!! - - - - - - کہ جب وہ قرآن کے معانی کو اپنے دل کے پہلو میں رکھ کر دیکھتا ہے تو وہ ایسے محسوس کرتا ہے گویا کہ قرآن خود ان کے قلب میں لکھا ہوا موجود ہو اور وہ اسے اپنے لوحِ قلب ہی سے پڑھ رہا ہو۔

دوسری قسم کے لوگ وہ ہوتے ہیں جو پوری استعداد، بھرپور دل اور مکمل زندگی کے مالک نہیں ہوتے اس لیے وہ کسی شاہد کے محتاج ہوتے ہیں جو حق و باطل کے مابین تمیز میں ان کی مدد کرے — ایسے لوگوں کی دل کی زندگی اور روشنی اور ان کی فطرت کی پاکیزگی صاحبِ دلِ بیدار کے درجے کی نہیں ہوتی۔ چنانچہ ایسے لوگوں کے لیے ہدایت کے حصول کا راستہ یہ ہے کہ ایک تو وہ خوب کان لگا کر سنیں اور دوسرے اپنے دل کو کلام پر غور و فکر اور اس کے معنی و مفہوم کو سمجھنے پر پوری یکسوئی کے ساتھ لگا دیں۔ تب کہیں جا کر اس کی حقانیت ان پر واضح ہوگی۔

پہلے گروہ کا حال اس شخص کا سا ہے جو ان چیزوں کا جن کی طرف بلایا جا رہا ہے یا جن کی خبر دی جا رہی ہے خود بچشم سر مشاہدہ و معائنہ کرتا ہے۔ یہ لوگ علم الیقین کو پا لیتے ہیں اور پھر ان کے قلوب ترقی کے مدارج طے کرتے ہوئے عین الیقین کی منزل تک جا پہنچتے ہیں ——— اور یہ درجۂ احسان ہے؛

جبکہ دوسرے لوگ، فامتر مخبر و داعی کی صداقت پر اعتماد کرتے ہیں اور اس کی تصدیق کرتے ہیں پر کفر سے نکل کر اسلام میں داخل ہو جاتے ہیں ——— اور یہ مقامِ ایمان ہے!!

واضح رہے کہ "عین الیقین" کے دو درجے اور مرتبے ہیں: ایک دنیا کے ساتھ مخصوص ہے اور دوسرا آخرت کے ساتھ۔

دنیا کا "عین الیقین"، قلب سے وہی تعلق رکھتا ہے جو معائنہ اور مشاہدہ آنکھ کے ساتھ۔ گویا کہ غیب کی جن باتوں کی خبر رسولؐ نے دی ہے جس طرح آخرت میں ان کا مشاہدہ آنکھ سے ہوگا۔ اسی طرح دنیا میں ان کا ادراک قلب اور اس کی بصیرت کے ذریعے ہوتا ہے ——— اور یہ دونوں "عین الیقین" ہی کے دو درجے ہیں؛

★

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف (اقبال)

مولانا امین احسن اصلاحی

گھروں کے اندر کا پردہ

(۳)

گھروں کے اندر کا پردہ

اب آیئے سورۂ نور کی آیتوں پر غور فرمایئے جو گھر کے اندر کے پردہ سے متعلق ہیں۔ لیکن ان پر غور کرنے سے پہلے دو باتیں بطور تمہید پیشِ نظر رکھنی ضروری ہیں۔

(الف) ایک یہ کہ ان آیات کا تعلق رشتہ داروں، عزیزوں، گھر کے کام کاج کرنے والے غلاموں، ملازموں اور اعتماد کے دوستوں سے ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک طرف معاشرتی زندگی کو پُرلطف، خوشحال اور آسان رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ تعلق رکھنے والوں کو گھروں میں آنے جانے، ملنے جلنے اور اجتماعی و انفرادی طور پر کھانے پینے کی اجازت دی جائے اور دوسری طرف صحیح اخلاقی نقطۂ نگاہ یہ مطالبہ کرتا ہے کہ ان پر کچھ ایسی پابندیاں بھی عائد کی جائیں کہ گھروں کی زندگی میں بدنگاہی اور بدچلنی راہ نہ پائے۔ اسلام کو، جو دینِ فطرت ہے، یہ دونوں مطالبات پورے اعتدال و توازن کے ساتھ ملحوظ رکھنے ہیں۔

(ب) دوسری بات یہ یاد رکھئے کہ عرب میں مشترک خاندانی نظام (JOINT FAMILY SYSTEM) کا رواج نہیں تھا۔ ہر بالغ جب شادی کر لیتا اپنا گھر الگ بسانے کی کوشش کرتا۔ باپ کا گھر الگ، چچا کا گھر الگ، بھائی کا گھر الگ، بہن کا گھر الگ اور خود اس کا اپنا گھر الگ۔ اس طرح ایک ہی خاندان کے بہت سے الگ الگ گھر بن جاتے۔ جو علیحدہ علیحدہ بھی ہوتے اور باہم دگر فطری اور معاشرتی علائق میں مربوط بھی۔

(ج) تیسری بات یہ ہے کہ سادہ تمدنی زندگی کی وجہ سے اس زمانہ میں عموماً نہ تو زنانہ مکانوں کے ساتھ مردانہ بیٹھکوں کا رواج تھا اور نہ دروازوں پر پردے ہی ہوتے تھے۔

عرب کی معاشرتی اور تمدنی زندگی سے متعلق ان امور کو پیشِ نظر رکھ کر سورۂ نور کی ان آیتوں کو پڑھیئے۔ فرمایا:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَدْخُلُوا۟

اے ایمان والو! نہ داخل ہو اپنے گھروں کے سوا دوسرے

بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَ
تُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ
فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا
حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا
فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ
عَلِيْمٌ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا
بُيُوْتًا غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ
وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ
قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ
وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ
اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ وَقُلْ
لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ
وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ
زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ
بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ
زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ
بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ
اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ
اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي
الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ
لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ وَلَا
يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ
زِيْنَتِهِنَّ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا
اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۲۷-۳۱-نور)

کے گھروں میں جبتک تمہارا ان سے انس نہ ہو اور تم اس گھر والوں پر سلام نہ کر لو یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ تاکہ تم کو یاد دہانی حاصل ہو جایا کرے۔ اگر گھر کے اندر کسی کو نہ پاؤ تو اس وقت تک نہ داخل ہو جب تک تمہیں اجازت نہ ملے اور اگر تم سے کہا جائے لوٹ جاؤ تو لوٹ جاؤ یہ تمہارے لئے زیادہ پاکیزگی بخش طریقہ ہے اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے باخبر ہے۔ تمہارے لئے ان گھروں میں داخل ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ جن میں عورتیں نہ رہتی ہوں اور ان میں تمہارا کوئی کام ہو اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو۔ گھروں کے اندر داخل ہونے کی صورت میں مسلمانوں کو یہ حکم دو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرم کی جگہوں کی حفاظت کریں یہ ان کیلئے زیادہ پاکیزگی بخش طریقہ ہے۔ اسی طرح مسلمان عورتوں کو حکم دو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرم کی جگہوں کو محفوظ کریں اور اپنی زینت کی چیزوں میں سے کسی چیز کو ظاہر نہ کریں مگر جس کا ظاہر ہونا ناگزیر ہو اور وہ اپنی اوڑھنیوں کے بکل مار لیا کریں اپنے گریبانوں پر اور نہ ظاہر کریں اپنی زینت کو مگر اپنے شوہروں یا اپنے باپوں یا اپنے سسروں یا اپنے بھائیوں یا اپنے بھتیجوں یا اپنے بھانجوں یا اپنی دینی بہنوں یا اپنے غلاموں کے سامنے یا اپنے ایسے ملازموں کے سامنے جو عورت کی ضرورت سے مستغنی ہو چکے ہوں یا ایسے بچوں کے سامنے جو ابھی سرے سے عورتوں کے بھید سے واقف ہی نہ ہوئے ہوں اور زمین پر پاؤں مار کر نہ چلیں کہ ان کی زینت کا اظہار ہو اور اللہ کی طرف رجوع کرو اے ایمان والو تم سب تاکہ تم کامیابی حاصل کرو۔

گھر کے اندر کے پردہ سے متعلق اصولی قوانین

مذکورہ بالا آیات میں گھروں کے اندر داخل ہونے سے متعلق مندرجہ ذیل ہدایات دی گئی ہیں۔

۱۔ کوئی مسلمان کسی مسلمان کے زنانہ مکان کے اندر داخل نہیں ہو سکتا مگر دو شرطوں کے ساتھ۔ ایک یہ کہ گھر والوں کے لئے وہ اجنبی نہ ہو۔ بلکہ ان کے ساتھ اس کا انس اور ربط ضبط ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ داخل ہونے سے پہلے سلام کر کے داخل ہونے کی اجازت حاصل کرے۔

انس کی صورتیں کئی ایک ہو سکتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ گھر والوں کے ساتھ قرابت اور رشتہ داری کا تعلق رکھتا ہو یا صاحب خانہ کا قابل اعتماد دوست ہو۔ یا گھر والوں کے ساتھ خدمت اور غلامی کا تعلق رکھتا ہو۔

سلام اجازت حاصل کرنے کا ایک مہذب اور بابرکت طریقہ ہے اور اس کی صورت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتائی ہے کہ دروازے پر تین مرتبہ سلام کرے۔ اگر کوئی جواب اور اجازت نہ ملے تو واپس لوٹ جائے۔

۲۔ اگر گھر پر صاحب خانہ موجود نہ ہو تو جب تک اجازت نہ ملے داخل نہ ہو اور اگر لوٹ جانے کو کہا جائے تو بلا تکلف لوٹ جائے۔

۳۔ جو مکانات زنانہ نہ ہوں مذکورہ بالا اجازت کی شرط سے مستثنیٰ ہیں۔ مثلاً مردانہ بیٹھکوں میں ہر شخص آجا سکتا ہے۔

۴۔ داخل ہونے والے مرد کو چاہئے کہ وہ اپنی نگاہ نیچی رکھے۔ اور شرم کی جگہوں کے معاملہ میں پوری احتیاط برتے۔

۵۔ اس حالت میں گھر کی بیبیاں مندرجہ ذیل ہدایات پر عمل کریں۔

(ا) اپنی نگاہیں نیچی رکھیں۔ (ب) اپنی شرم و احتیاط کی جگہوں کو پوری طرح محفوظ کریں۔ (ج) اس طرح سمٹ سمٹا جائیں اور کپڑوں کو اس طرح سنبھال لیں کہ ان کی زینت کی چیزیں ظاہر نہ ہوں۔ صرف وہ زینت اس سے مستثنیٰ ہے جس کا ظاہر ہونا ناگزیر ہو مثلاً لباس کا ظاہری حصہ (د) اپنی اوڑھنیوں کے بکل مار لیں تاکہ سینہ چھپ جائے۔ (ہ) چلتے پھرتے زمین پر پاؤں مار کر نہ چلیں کہ پازیب کی جھنکار سنائی دے۔

۶۔ تمام محرم اور نامحرم عزیزوں اور متعلقین کے لئے گھروں کے اندر آنے جانے میں مذکورہ بالا

قوانین کی پابندی لازمی ہے۔ البتہ عورت کے لئے زینت کی چیزوں کے اظہار کی جو ممانعت ہے، اس سے خاوند اور محرم اعزا یعنی باپ، بھائی، بھتیجے، بھانجے وغیرہ مستثنیٰ ہیں۔ اسی طرح ملازم کے بجز غیر اولی الاربۃ (عورت کی ضرورت سے مستغنی) کی قید لگا کر یہ واضح کر دیا کہ جوان ملازم کے سامنے اظہار زینت جائز نہیں اور ملازم اور غلام دونوں کا ذکر چونکہ آیت میں الگ الگ موجود ہے اس وجہ سے ملازم کو غلام پر قیاس کرنا بالکل غلط ہوگا۔ ایک عام خادم اور غلام میں معاشرتی اور نفسیاتی اعتبارات سے آسمان و زمین کا فرق ہے۔ نابالغ بچوں کو بھی اس سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں دینی بہنوں کو مستثنیٰ کیا گیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ قطامہ عورتوں کے سامنے شریف زادیوں کو اظہار زینت سے بچنا چاہئے؛ مبادا وہ کسی فتنہ میں مبتلا کر دیں۔

بعض ضروری تشریحات

گھروں کے اندر کے پردہ کے متعلق یہ اصولی قوانین ہیں۔ اس کے بعد لوگوں کے سوال پر اس سے متعلق بعض مزید تشریحات اور ہدایات نازل ہوئیں جو یہ ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ
الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَالَّذِيْنَ
لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ
مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِيْنَ
تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَمِنْۢ
بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ
لَّكُمْ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌۢ
بَعْدَهُنَّ طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ
عَلٰى بَعْضٍ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ
الْاٰيٰتِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ وَاِذَا بَلَغَ
الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَاْذِنُوْا كَمَا اسْتَاْذَنَ
الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ
اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝
وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِيْ

اے ایمان والو، تمہارے غلام اور قریب البلوغ بچے تین اوقات میں اجازت لیا کریں۔ نماز فجر سے پہلے، اور دوپہر کے وقت جب تم کپڑے اتارتے ہو اور عشاء کے بعد۔ یہ تین اوقات تمہاری بے پردگی کے ہیں۔ ان کے علاوہ اوقات میں تمہارے اوپر اور ان کے اوپر اس بات میں کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ بے اجازت آئیں جائیں۔ تم ایک دوسرے کے پاس ہر وقت آنے جانے والے ہو۔ اسی طرح اللہ اپنی آیتوں کو واضح کرتا ہے اور اللہ علم والا اور حکمت والا ہے۔ اور جب تمہارے بچے بلوغ کو پہنچ جائیں تو وہ بھی اسی طرح اجازت لیں جس طرح ان سے پہلوں نے اجازت لی ہے۔ اسی طرح اللہ تمہارے لئے اپنی آیتوں کو واضح کرتا ہے اور اللہ علم والا اور حکمت والا ہے۔ اور بوڑھی عورتیں جو اب نکاح کی

لَا يَرْجُوْنَ نِكَاحًا فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ
جُنَاحٌ اَنْ يَّضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ
مُتَبَرِّجٰتٍۢ بِزِيْنَةٍ وَاَنْ يَّسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ
لَّهُنَّ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ (۵۸-۶۰۔ نور)

امیدوار نہیں ہیں ان پر اس بات میں کوئی حرج نہیں کہ وہ اپنے کپڑے الگ کریں بشرطیکہ زینت کا اظہار کرنے والی نہ ہوں اور احتیاط رکھیں تو ان کیلئے زیادہ بہتر ہے اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے

بعض رخصتیں اور ان کے حدود

مذکورہ بالا آیات میں تین ہدایتیں بیان ہوئیں۔

(۱) غلاموں اور نابالغ بچوں کو گھر کے اندر آنے جانے کے لئے ہر وقت اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف نماز فجر سے پہلے، دوپہر کے وقت اور عشا کے بعد اجازت لینی ضروری ہے۔ ان اوقات میں بلا اجازت آنے میں اندیشہ ہے کہ وہ گھر والوں کو کسی ایسی حالت میں دیکھ لیں جس حالت میں دیکھنا نامناسب ہو۔ یہ ضرورت کے لحاظ سے اوپر والے احکام میں گویا تخفیف کی گئی ہے

(۲) نابالغ بچوں کے لئے یہ رخصت صرف اس وقت تک ہے جب تک وہ نابالغ ہیں۔ بلوغ کے بعد ان کو بھی اجازت کے اسی عام قاعدہ پر عمل کرنا پڑے گا جو سب کے لئے بیان ہوا ہے۔

(۳) بوڑھی عورتوں کے لئے بہتر تو یہی ہے کہ وہ پردہ کے تمام ضوابط کی پابندی کریں۔ لیکن اگر اظہار زینت مقصود نہ ہو تو وہ گھروں کے اندر بھی اور باہر بھی پردہ کے اس خاص اہتمام سے آزاد رہ سکتی ہیں جو اوپر بیان ہوا ہے۔ مثلاً بکل مارنے اور گھونگھٹ لٹکانے کی ان کو ضرورت نہیں ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

اس کے بعد ایک اور شبہ کی طرف توجہ فرمائی جو اوپر کے احکام کی وجہ سے اس وقت بہت سے ذہنوں میں پیدا ہو چلا تھا۔ وہ یہ کہ جب لوگوں نے دیکھا کہ اسلام نے گھروں کے اندر آنے جانے پر بہت سی پابندیاں عائد کر دی ہیں یہاں تک کہ قریبی اعزہ بھی ان قیود سے نہیں بچ سکے ہیں تو ایک طرف لوگوں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ شاید اسلام سوشل زندگی کی آزادیوں اور دلچسپیوں کو ختم کرنا چاہتا ہے اور اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ اعزہ و احباب ایک دوسرے سے بے تکلفانہ ملیں جلیں اور ایک دوسرے کے یہاں کھائیں پئیں۔ دوسری طرف بعض لوگوں نے یہ خیال کیا کہ بہتوں کے مریض اور معذور اعزا جو ان پابندیوں سے پہلے اپنے رشتہ داروں کے گھروں میں پڑے رہتے تھے۔ ان پابندیوں کے بعد وہ ایک نہایت راحت بخش آزادی سے محروم ہو گئے۔

قرآن نے ان دونوں شبہوں کو صاف کر دیا کہ ان پابندیوں کو عائد کرنے سے مقصود نہ تو سوشل

زندگی کی دلچسپیوں کو ختم کرتا ہے۔ نہ معذوروں اور عاجزوں کو کسی زحمت میں ڈالتا ہے۔ نہایت شوق کے ساتھ اپنے اقربا اور اپنے دوستوں کے گھروں میں آجاؤ۔ اور ایک دوسرے کے یہاں جماعتی اور انفرادی شکل میں جس طرح چاہو کھاؤ پیو۔ البتہ اجازت حاصل کرنے کے لئے سلام ضرور کر لیا کرو۔ اگر یہ چیز کوئی پابندی ہے تو یہ ایسی پابندی ہے۔ جو تمہارے لئے بھی اور گھر والوں کے لئے بھی بہت سی برکتوں کا باعث ہے چنانچہ فرمایا۔

لَيْسَ عَلَى الْأَعْمَىٰ حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ وَلَا عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَن تَأْكُلُوا مِن بُيُوتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ آبَائِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أُمَّهَاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ إِخْوَانِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَخَوَاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَعْمَامِكُمْ أَوْ بُيُوتِ عَمَّاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَخْوَالِكُمْ أَوْ بُيُوتِ خَالَاتِكُمْ أَوْ مَا مَلَكْتُم مَّفَاتِحَهُ أَوْ صَدِيقِكُمْ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَأْكُلُوا جَمِيعًا أَوْ أَشْتَاتًا فَإِذَا دَخَلْتُم بُيُوتًا فَسَلِّمُوا عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُبَارَكَةً طَيِّبَةً كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ (۶۱۔ نور)

نہ کسی نابینا پر کوئی ہرج ہے نہ کسی لنگڑے پر نہ کسی بیمار پر اور نہ خود تم لوگوں پر کہ کھاؤ پیو اپنے گھروں میں یا اپنے باپوں کے گھروں یا اپنی ماؤں کے گھروں میں یا اپنی بہنوں کے گھروں میں، یا اپنے چچاؤں کے گھروں یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں میں یا اپنے ماموؤں کے گھروں میں یا اپنی خالاؤں کے گھروں میں، یا اس کے گھر میں جو تمہاری تولیت اور اہتمام میں یا اپنے کسی دوست کے گھر میں۔ تمہارے اوپر کوئی گناہ نہیں ہے کہ تم کھاؤ پیو اجتماعی شکل میں یا الگ الگ۔ البتہ جب گھروں میں داخل ہو تو سلامتی بھیج کر اپنے آپ پر، خدا کی طرف سے سلامتی بابرکت اور پاکیزہ۔ اسی طرح اللہ واضح کرتا ہے اپنی آیتوں کو تاکہ تم سمجھو۔

اوپر کے مباحث کا خلاصہ اوپر کے مباحث سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ قرآن شریف میں دو طرح کے پردے کے احکام بیان ہوئے ہیں۔ ایک اس صورت کے لئے جب عورت کو گھر سے باہر نکلنا پڑے اور اجنبیوں سے سابقہ پڑنے کا اندیشہ ہو۔ دوسرے اس صورت کے لئے جب گھر کے اندر خود اس کے یا اس کے شوہر کے اعزا و اقربا، اور متعلقین و ملازمین اور اس طرح کے لوگ آئیں۔ پہلی صورت سے متعلق حکم سورۂ احزاب میں دیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ عورت اپنے اوپر بڑی چادر لے کر نکلے اور اس

کا گھونگھٹ چہرے پر ڈالے۔ دوسری صورت سے متعلق احکام سورۂ نور میں دیئے گئے ہیں اور اس سلسلہ کے اصولی مسائل یہ ہیں۔

(۱) کوئی اجنبی شخص بغیر کسی تعلق کے کسی کے زنانہ مکان کے اندر داخل نہ ہو۔

(۲) اہل تعلق میں سے جو داخل ہو وہ اجازت لے کر داخل ہو۔

(۳) داخل ہونے والا اپنی نگاہ نیچی رکھے اور اپنی شرم کی جگہوں کے معاملے میں پوری احتیاط برتے

(۴) گھر کی عورتیں اپنی نگاہیں نیچی رکھیں، سمٹ سمٹا کر رہیں، زینت کی چیزوں میں سے اگر کسی چیز کا اظہار ہو، تو مجبوراً ہو۔ بکل مار لیا کریں ...... زمین پر پاؤں مار کر نہ چلیں۔

(۵) زینت کی چیزوں کا اظہار صرف شوہر اور محرم عزیزوں کے سامنے جائز ہے۔ نیز غلام اور بوڑھے ملازم اور نابالغ کے سامنے بھی ان کے اظہار میں کوئی حرج نہیں ہے۔

(۶) غلاموں اور نابالغ بچوں کے لئے ہر وقت اجازت لینا ضروری نہیں ہے۔ صرف ان اوقات میں اجازت لینا ضروری ہے جو اوقات خاص پردہ کے ہیں اور جن میں ان کا اچانک آجانا ان کے لئے بھی اور گھر والوں کے لئے بھی احتیاط اور حیا کے منافی ہے۔

(۷) بوڑھی عورتوں کے لئے رخصت ہے۔ وہ بغیر برقعہ کے باہر نکل سکتی ہیں۔ بشرطیکہ اظہار زینت مقصود نہ ہو۔ اگرچہ بہتر یہی ہے کہ وہ بھی پردہ کے احکام کی پابندی کریں۔

اصولی احکام کے تحت بعض رخصتیں پردہ سے متعلق یہ اصولی اور بنیادی قوانین ہیں جو خود قرآن مجید میں بیان ہوتے ہیں اور جن کے بارہ میں کسی شبہہ یا اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر ان میں کسی پہلو سے اختلاف ہو سکتا تھا اور ہوا ہے، تو وہ صرف یہ پہلو ہے کہ عام طور پر لوگ سورۂ نور اور سورۂ احزاب کے احکام کے الگ الگ موقع و محل سے واقف نہیں ہیں۔ اس وجہ سے اس مسئلہ پر جو کچھ اب تک لوگوں نے لکھا ہے اس میں ایک سخت قسم کا تناقض پایا جاتا ہے اور اس تناقض کی وجہ سے ان کے نتائج بحث جس قدر پردہ کے حامیوں کے لئے مفید ہیں اسی قدر بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی پردہ کے مخالفوں کے مفید مطلب ہیں۔ اس مضمون میں اس تناقض کو پوری طرح رفع کر دیا گیا ہے اور پردہ سے متعلق تمام آیات کے صحیح صحیح محل کو معین کر دیا گیا ہے۔ جس کے بعد کسی منصف اور خدا ترس آدمی کے لئے اس معاملہ میں راہِ حق سے انحراف کی کوئی وجہ باقی نہیں رہ گئی ہے۔ اس وضاحت کے بعد بھی اگر کوئی شخص اس مسئلہ میں کجروی اختیار کرے تو وہ شخص یا تو سخت ہٹ دھرم

ہے یا سخت کج فہم اور ایسے شخص سے کبھی یہ توقع نہیں رکھنی چاہئے کہ وہ کسی حق کو اپنی خواہش کے خلاف قبول کرے گا خواہ وہ حق کتنا ہی واضح کیوں نہ ہو۔

ان احکام پر غور کرنے سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پردہ کے بارہ میں خواہ گھروں کے اندر کا پردہ ہو یا گھروں سے باہر کا ــــ ہم کو نہایت واضح اور قطعی ہدایات دی ہیں ان واضح اور قطعی احکام کے بعد اس باب میں اگر کوئی چیز سکھانے اور بتانے کی باقی رہ گئی تھی تو وہ صرف بعض جزوی اور ضمنی مسائل تھے جو یا تو اہل علم کے اجتہاد پر چھوڑے گئے ہیں یا پیغمبر کے قول و عمل سے ان کی تشریح ہو گئی ہے۔ چنانچہ ان کلیات کے تحت خاص خاص حالات کے لئے جو رخصتیں ملی ہوئی ہیں ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو شریعت نے اجازت دی ہے کہ وہ اس کو ایک نظر دیکھ سکتا ہے۔ اگر پولیس یا جج کو کسی عورت کی شناخت مطلوب ہو تو ان کو بھی اجازت ہے کہ وہ اس کو دیکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح کسی طبی ضرورت کے تحت ایک طبیب یا ڈاکٹر کو بھی یہ اجازت حاصل ہے کہ وہ کسی اجنبی عورت کو دیکھ یا چھو سکتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس ناگہانی حالات (EMERGENCY) کے لئے یہ قوانین بڑی حد تک نرم کر دیئے گئے ہیں۔ مثلاً کسی مکان میں اگر آگ لگ جائے یا کوئی عورت پانی میں ڈوب رہی ہو تو اس حالت میں مقدم یہ ہے کہ عورت کی جان بچانے کی کوشش کی جائے۔ اگرچہ اس کوشش میں پردہ کے شرعی احکام کا لحاظ قائم نہ رکھا جا سکے۔ اسی طرح سفر (خصوصاً سفر حج) اور جنگ کی حالت میں بھی ضرورت و مصلحت کے لحاظ سے بعض مستثنیات اور رخصتیں ہیں۔ جن کی احادیث میں تصریح آگئی ہے۔ نیز اس سلسلہ کے بعض دوسرے ضمنی اور جزوی مسائل بھی ہیں جو ائمہ مجتہدین نے کھول دیئے ہیں اور وہ فقہ کی کتابوں میں موجود ہیں۔ یہ تمام جزوی اور ضمنی مسائل اپنے باب کے اصولی اور بنیادی احکام پر مبنی ہیں۔ اس وجہ سے یہ تو ہو سکتا ہے کہ ان جزوی مسائل سے اسی طرح کے حالات کے لئے کچھ اور احکام استنباط کر لئے جائیں لیکن یہ بات بالکل غلط ہوگی کہ ان رخصتوں اور مستثنیات کو اصل قرار دے کر پردے سے متعلق تمام بنیادی اصولوں کو ڈھا دینے کی کوشش کی جائے۔ اس طرح کی جسارت دین کے معاملہ میں صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو شریعت سے بالکل جاہل ہیں۔ روایات اور احادیث میں اگر ایسے واقعات ملتے ہیں کہ دوران جنگ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی

بیویوں نے پردہ کے قوانین کا لحاظ نہیں رکھا تو یہ اس بات کا ثبوت تو بلا شبہ ہے کہ عام حالات کے لئے اسلام نے پردہ کے جو احکام دیئے ہیں، خاص طرح کے حالات پیش آجانے سے ان میں بہت بڑی حد تک ڈھیل کر دی جاتی ہے۔ لیکن یہ اس بات کا ثبوت ہرگز نہیں ہے کہ اسلام نے سرے سے کوئی حکم ہی نہیں دیا ہے اور عورتوں کو اذن عام ہے کہ وہ کھلے بندوں جہاں چاہیں پھریں۔ اگر یہ طرز استدلال صحیح مان لیا جائے تو ایک شخص یہ بھی دعویٰ کر سکتا ہے کہ اسلام میں سرے سے وضو کا کوئی حکم ہی نہیں دیا گیا ہے۔ کیونکہ بہت سی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے محض تیمم کر کے نمازیں پڑھی ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس ایک شخص یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ قیام نماز کا کوئی ضروری رکن نہیں ہے۔ کیونکہ صحابہ اور صحابیات میں سے بہتوں نے بیٹھ کے نمازیں ادا کی ہیں۔ اگر یہ طرز استدلال غلط ہے اور ظاہر ہے کہ غلط ہے تو یقیناً ان لوگوں کا استدلال بھی صحیح نہیں ہو سکتا جو بعض مستثنیات کی بنا پر، جن کا تعلق مخصوص حالات سے ہے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام میں سرے سے پردہ کا کوئی حکم ہی نہیں ہے اور ملّاؤں نے یہ چیز اپنی طرف سے گھڑ کے بعد میں مسلمانوں کی زندگی کے اندر شامل کر دی ہے۔

مروجہ پردہ اور قرآنی پردہ

اوپر کی تفصیلات سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو چکی ہے کہ قرآن میں پردہ کے متعلق نہایت واضح اور تفصیلی احکام ہیں۔ نیز یہ حقیقت بھی واضح ہو چکی ہے کہ سورۂ نور میں مردوں اور عورتوں کو نگاہیں نیچی رکھنے کا جو حکم دیا ہے اس کا تعلق دراصل گھر کے اندر کے پردہ سے ہے۔ جہاں اپنے عزیزوں اور تعلق کے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ باہر کے پردہ کے بارے میں وہی ادنائے جلباب (اوپر بڑی چادر لینا اور اس کا گھونگھٹ چہرہ پر لٹکا لینا) کا حکم ہے جو سورۂ احزاب میں دیا گیا ہے۔ نیز زینت کے اظہار کی ممانعت اور ناگزیر طور پر ظاہر ہو جانے والی زینت کے استثنا کا تعلق بھی گھر کے اندر کے پردہ سے ہے۔ ان کو باہر نکلنے کی صورت سے جو لوگ متعلق کرتے ہیں انہوں نے قرآن شریف پر غور نہیں کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ ایک سخت قسم کے تعارض اور تناقض میں مبتلا ہیں۔

اوپر کے مباحث سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی ہے کہ جس طرح موجودہ بے پردگی قرآن کے بالکل خلاف ہے۔ اسی طرح مروجہ پردہ بھی بہت بڑی حد تک قرآن کے بالکل خلاف ہے۔ بالخصوص گھروں کے اندر کے پردہ سے متعلق قرآن نے جو احکام دیئے ہیں وہ تو یک قلم

بھلا دیئے گئے ہیں۔ ان کی جگہ یا تو ایک بالکل غلط قسم کی آزادی اور بے قیدی نے لے رکھی ہے۔ یا ایک بالکل ناروا قسم کی پابندی نے۔ یا تو یہ حالت ہے کہ قریب کے رشتہ داروں اور عزیزوں سے بھی لوگ اس طرح کے پردہ کو ضروری سمجھتے ہیں جس قسم کا پردہ اجنبیوں اور بیگانوں سے ضروری قرار دیا گیا ہے۔ یا یہ حالت ہے کہ جن لوگوں کے ساتھ قرابت و رشتہ داری کی کوئی ادنیٰ وابستگی بھی ہو جاتی ہے ان کے لئے سرے سے کسی قسم کے پردہ کی ضرورت ہی نہیں خیال کی جاتی۔ اس افراط و تفریط کا نتیجہ یا تو یہ ہے کہ اس سے بہت سے خاندانوں کی اجتماعی زندگی متاثر ہو جاتی ہے اور ان کے درمیان وہ انس اور وہ ربط و ضبط باقی نہیں رہ جاتا ہے جس کو اسلام نے باقی رکھنا چاہا ہے اور جس کی بربادی اسلامی معاشرہ کی بربادی کے ہم معنی ہے۔ اس افراط و تفریط سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ قرآن نے جس حد تک ڈھیل دی ہے اس سے بھی پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے اور جو پابندیاں عائد کی ہیں ان کا بھی پورا پورا لحاظ رکھا جائے۔ اسی طریقہ پر عمل کرنے سے وہ اجتماعی زندگی وجود میں آئے گی جس میں عفت اور آزادی دونوں چیزیں پورے اعتدال و توازن کے ساتھ موجود ہوں گی اور جس کے اندر ہی اس صحیح اسلامی اخلاق کی تربیت ممکن ہو سکے گی جو مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کے لئے اللہ اور اس کے رسول نے پسند فرمایا ہے۔

ہم سے طلب فرمائیں

انوارِ مجددی

یعنی حضرت مجدد الف ثانیؒ کے چیدہ چیدہ مکتوبات، سلیس اور شگفتہ ترجمہ مع تعارفِ مکتوب الیہم و حواشیِ مفیدہ

از پروفیسر یوسف سلیم چشتی

سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۱۰۸۴ مجلد مع ڈسٹ کور

قیمت چار روپے — محصول ڈاک اس کے علاوہ

دارالاشاعت الاسلامیہ، کوٹھا سابقہ امرت الٰہ روڈ اسلام پورہ (سابقہ کرشن نگر) لاہور

ڈاکٹر محمد رفیع الدین
ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ

اسلامی تحقیق

اس کے معنے و مدعا اور دائرہ کار

(۲)

میکانکی اسلامی تحقیق اور اصلی اسلامی تحقیق بعض اوقات ایک دوسرے کے اوپر منطبق ہو جاتی ہیں

بعض وقت اصلی اسلامی تحقیق اور میکانکی اسلامی تحقیق ایک دوسرے کے اوپر منطبق ہو جاتی ہیں جس کی وجہ سے اصلی تحقیق کی کسی پیداوار کے اندر مقدس کتابوں کے مشکلات کی ترتیب نو یا ترکیب جدید کی صورت میں میکانکی تحقیق کے کچھ عناصر شامل ہو جاتے ہیں یا میکانکی تحقیق پر ان مشکلات کی تشریح یا تفسیر کا بھی ایک رنگ چڑھ جاتا ہے۔ تاہم اسلامی تحقیق کی کسی پیداوار کی قدر و قیمت کا انحصار اس بات پر ہوگا کہ اس میں اصلی اسلامی تحقیق کا عنصر کس قدر موجود ہے۔ اگر اس میں درستی اور علم کے اعتبار سے بلند معیار رکھنے والی اصلی اسلامی تحقیق کا عنصر زیادہ ہو گا تو اس کی قدر و قیمت بھی زیادہ ہو گی۔ یہی سبب ہے کہ اقبال۔ ابن تیمیہ۔ شاہ ولی اللہ۔ غزالی۔ رومی اور محی الدین ابن عربی کی اسلامی تحقیق دوسرے سینکڑوں علماء متقدمین و متاخرین کی تحقیق سے بدرجہا زیادہ قیمتی سمجھی جاتی ہے۔ ان میں سے ہر عالم دین نے اپنے زمانہ میں اسلام کی وہ جدید علمی اور عقلی تشریح بہم پہنچائی ہے جس کی اس کے زمانہ میں لوگوں کو ضرورت تھی۔ اقبال نے اسلام کی جو تشریح کی ہے، اس کی شدید ضرورت کا زمانہ ابھی موجود ہے۔

وحی اور عقل سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس بات کی ضرورت ہی کیا ہے کہ عقل اور علمی نقطۂ نظر سے اسلام کی کوئی تشریح کی جائے اور بار بار کی جائے۔ کیا یہ بات صحیح نہیں کہ قرآن اور حدیث دونوں مل کر انسانی افراد کے اعتقاد و عمل کی راہ نمائی کرنے کے لئے پوری طرح کافی ہیں۔ کیا قرآن اور حدیث نے پہلے ہی ضروری حد تک اپنے مطالب کی وضاحت نہیں کر دی۔ کیا ہمیں اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم خدا کی وحی کے فرامین اور خدا کے رسولؐ کے ارشادات میں ایک پیچ اپنی طرف سے بھی لگائیں اور ان میں اپنی انسانی سمجھ بوجھ اور انسانی عقل و فراست کی بنا پر بھی کچھ باتوں کا اضافہ کریں تاکہ وہ زیادہ قابل فہم اور

زیادہ مفید بن جائیں۔ بالخصوص اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ ہم کو اچھی طرح سے معلوم ہے کہ انسان کی ہدایت کے ایک ذریعہ کے طور پر انسانی عقل خدا کی وحی کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

یہ بات بالکل درست ہے کہ خدا کی وحی کے مقابلہ میں عقلِ انسانی کا ہرگز کوئی مقام نہیں کہ وہ انسان کو یہ بتاسکے کہ انسان اور کائنات کی حقیقت کیا ہے اور اس حقیقت کی روشنی میں انسانی فرد اور جماعت کو اپنی عملی زندگی کی تشکیل کس طرح سے کرنی چاہیئے۔ اس کے باوجود خدا کی وحی اور انسانی عقل کے درمیان ایک ایسا قدرتی رشتہ ہے جو ٹوٹ نہیں سکتا اور جس کی بنا پر ذیل کے حقائق بالکل درست اور ہر قسم کے شکوک و شبہات سے بالا ہیں۔

اوّل یہ کہ ہم خدا کی وحی کو اس وقت تک قبول نہیں کرسکتے جب تک کہ ہماری عقل اس وجدان یا یقین کی طرف راہ نمائی نہ کرے کہ وہ درحقیقت خدا کی وحی ہے اور حق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے انسان کو عقل سے کام لینے کی بار بار ہدایت کی ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہم ہر مدعی نبوت کو نبی نہیں مانتے اور جھوٹے اور سچے نبی میں اپنی عقل کو کام میں لاکر فرق کرتے ہیں؟

دوم یہ کہ خدا کی وحی ایسے الفاظ پر مشتمل ہوتی ہے جو آخر کار ضبطِ تحریر میں آجاتے ہیں اور ایک خارجی وجود رکھتے ہیں۔ اس سے پیشتر کہ کوئی پڑھنے والا یا سننے والا ان الفاظ پر ایمان لائے اور ان کے مطابق عمل کرے یہ ضروری ہے کہ وہ اس کے ذہن کے اندر کسی مطلب یا معنی یا مدعا میں تبدیل ہوں جب تک کہ وہ ایک خارجی حقیقت سے ایک داخلی احساس میں تبدیل کرنے والے اس عمل میں سے نہیں گزرتے (اور یاد رہے کہ تبدیلی کا یہ عمل سراسر ذہنی اور انسانی ہے۔ خدائی یا آسمانی نہیں) دوسرے لفظوں میں جب تک کہ وہ ایک علمی اور عقلی توجیہہ کا لباس نہیں پہن لیتے۔ اس وقت تک نہ تو وہ ایمان پیدا کرسکتے ہیں نہ عمل۔ یہی سبب ہے کہ ایک ہی وحی کا اتباع کرنے والے لوگوں کے اعتقادات اور اعمال مختلف ہیں اور اسلام جو ایک ہی ہے مذہبی فرقوں اور مذہبی تحریکوں میں اس قدر بٹا ہوا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہم قرآن حکیم کے مطالب کو سمجھتے اور سمجھاتے اور سیکھتے اور سکھاتے ہیں۔ ہمارے اس فعل کا مطلب یہ ہے کہ ہم قرآن کے الفاظ کو اس علمی اور عقلی توجیہہ کا لباس پہنانا چاہتے ہیں جو ہمارے ... مطابق ان کی اپنی صحیح توجیہہ ہے۔

سوم یہ کہ خدا کی وحی ہمیں انسان اور کائنات کی حقیقت کے متعلق ایک صحیح نظریہ عطا فرماتی ہے اور فلسفہ کی صورت میں انسان کی عقل بھی انسان اور کائنات کا صحیح نظریہ بہم پہنچانے کی کوشش کرتی ہے۔ عقلِ انسانی کا یہ وظیفہ جو اس نے خود بخود اپنے لئے تجویز کرلیا ہے۔ بیک وقت خدا کی

وحی کا وظیفہ بھی ہے۔ لہٰذا عقلِ انسانی خدا کی وحی کے بیانات کو قبول کرلینے کے بعد بھی ان کو زیرِ غور لانے کی طرف مائل رہتی ہے۔ یہ چاہتی ہے کہ جن سوالات کا قطعی جواب خدا کی وحی پہلے ہی دے چکی ہے یہ ان سوالات کا کوئی ایسا جواب بھی ڈھونڈھ نکالے، جو اس کے اپنے لئے بھی مکمل طور پر تسلی بخش ہو۔ مثلاً ایک سوال ہے کیا خدا فی الواقع موجود ہے۔ ایک آدمی اس سوال کے اس جواب پر جو خدا کی وحی نے دیا ہے مکمل یقین اور ایمان رکھ سکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ایک انسان کی حیثیت سے یعنی ایک دارائے عقل و فہم وجود کی حیثیت سے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس سوال کا وہ جواب بھی اپنے پاس موجود رکھے جو اس کی عقل اس کے لئے مہیا کرتی ہے۔ لیکن جب وہ ایسا کرے گا تو وہ مجبور ہوگا کہ دونوں کے جوابات کے اندر مطابقت پیدا کرے اور اسے قائم رکھے۔ ورنہ وہ دونوں سے پوری طرح مطمئن نہ ہوسکے گا۔

علمی ترقی کے ہر نئے دور میں اسلام کی نئی عقلی توجیہہ کی ضرورت

نوعِ انسانی کا ذہنی علم ہمیشہ ترقی کرتا رہتا ہے اور نئے حکیمانہ افکار کے اس مجموعہ کے اندر جو کسی دور میں رونما ہوتا ہے حق باطل کے ساتھ ملا ہوا ہوتا ہے۔ لہٰذا ہر دور میں اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ اصلی اسلامی تحقیق کی طرف رجوع کرکے حق کو باطل سے الگ کیا جائے۔ اور غلط اور مخالفِ اسلام حکیمانہ تصورات کی تردید کی جائے اور صحیح اور موافقِ اسلام حکیمانہ تصورات کو کام میں لاکر اسلام کی تائید مزید اور حمایت اور مدافعت کی جائے۔ ہر دور میں اصلی اسلامی تحقیق کے ماہرین کے لئے یہ اہم کام موجود ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے نئے علمی افکار کے دانہ کو کاہ سے الگ کریں۔ دانہ کو کام میں لائیں اور کاہ کو پھینک دیں کہ ہوا میں اس کو اڑا کرلے جائیں۔

دورِ حاضر میں اسلام کو حکیمانہ افکار کا چیلنج

تاہم علمی ترقی کے کسی دور میں بھی اسلام کو حکیمانہ افکار کی طرف سے ایسا زوردار اور خطرناک چیلنج کبھی نہیں دیا گیا جیسا کہ اب دورِ حاضر کے حکیمانہ افکار نے دیا ہے۔ اس وقت فلسفی، ماہرِ تاریخ، ماہرِ اقتصادیات، ماہرِ معاشیات اور ماہرِ نفسیات سب مل کر اسلام کی جڑوں پر حملہ کر رہے ہیں۔ میکانکی ارتقاء، تحلیل نفسی، حکیاتی سوشلزم، تاریخی مادیت، منطقی اثباتیت، کرداریت اور موجودیت کے نظریات جن کی مقبولیت اس زمانہ میں ہر روز ترقی کر رہی ہے اور جو نوعِ انسانی کے اعمال و افعال کو نہایت تیزی سے متاثر کر رہے ہیں۔ ہمارے مذہب کی بنیادوں کو غلط قرار دے رہے ہیں۔ اگر ہم ان نظریات کے علمی چیلنج کا مؤثر جواب نہ دیں اور ان کی یقین افروز تردید نہ کریں تو ہم مسلمان کی حیثیت سے زندہ نہیں رہ سکتے۔ اور ان نظریات کا جواب دیتے ہوئے ہمیں

اس بات کو بھی یاد رکھنا ہو گا کہ اگر ہمارا جواب دورِ حاضر کے علمی معیاروں پر پورا نہ اترسکے اور اپنے استدلال کے حقائق اور تکنیک اور طریقہ سے دنیا بھر میں چوٹی کے علماء اور حکماء کو مطمئن نہ کر سکے تو وہ ہرگز کوئی جواب نہ ہو گا۔ اس قسم کا جواب ہم نے ابھی تک پیدا نہیں کیا۔ کہاں ہیں وہ لوگ جو مسلمانوں کی علمی قیادت اور رہبری کے مدعی ہیں جنہوں نے منبروں کو سنبھال رکھا ہے۔ اور جنہوں نے اسلام پر لکھ لکھ کر تفسیروں، اسلامی کتابوں اور رسالوں کے ڈھیر لگا دیئے ہیں۔ افسوس کہ علماء دین جو کل تک اسلام اور کفر کی جنگ میں ہر محاذ پر اسلام کی مدافعت کے لئے پیش پیش رہتے تھے آج سو گئے ہیں اور اسلام کو جو نیا خطرہ درپیش ہے، مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کو اس کے مقابلہ کے لئے تیار کرنے کی کوشش کرنا تو درکنار اس کا ذکر تک نہیں کرتے۔ گویا اس کی موجودگی سے ہی ناآشنا ہیں۔

نتیجہ یہ ہے کہ غیر مسلم مفکرین بھی جو ہمارے مخالف ہیں اس خطرہ سے ہماری غفلت اور اس کے مقابلہ میں ہماری عافیت کوشی اور سہل انگاری پر ہمیں طعنے دے رہے ہیں۔ پروفیسر ڈبلیو ڈی سمتھ اپنی کتاب "موڈرن اسلام ان انڈیا" (MODERN ISLAM IN INDIA) میں لکھتا ہے:-

"جہاں دس یا بیس سال پہلے بازاروں کے موڑوں پر مذہبی مناظرے ہوا کرتے تھے اور تعلیم یافتہ مسلمان افکارِ جدیدہ کے متعلق کتابیں پڑھ پڑھ کر اپنا سر کھپاتے تھے، آج مسلمان نوجوان ان علمی مشکلات سے بے خبر اور بے پروا ہے جو زندگی کے صحیح راستہ کی حیثیت سے مذہب کو پیش آتی ہیں ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح سے آزاد خیال مسلمانوں نے ان اعتراضات کا قریباً مکمل جواب دیا۔ جو عیسائیوں نے اسلام پر وارد کئے تھے۔ آج تجدد پسند مسلمان اس جواب کو کافی سمجھتا ہے اور کوئی مسلمان ایسا پیدا نہیں ہوتا جو جواب دینا تو درکنار ان اعتراضات کا فقط ذکر ہی کرے جو اس زمانہ میں فلسفی، مؤرخ، ماہرِ نفسیات اور ماہرِ اجتماعیات نے اسلام پر اور سارے مذہب پر وارد کر رکھے ہیں۔ جس طرح انیسویں صدی کے کٹر مسلمان جو عیسائیوں اور آزاد خیال مغربیوں کے اعتراضات کا جواب دینے سے انکار کرتے تھے اور سرسید احمد اور امیر علی کو ان کا جواب دینے کی وجہ سے برا سمجھتے تھے۔ معاشرتی قدامت پسندی کا سہارا تھے اسی طرح سے وہ مسلمان بھی جو ان جدید اعتراضات کا جواب دینے سے قطع نظر کرتے ہیں۔ ان جماعتوں کی ہی اعانت کر سکتے ہیں جو معاشرتی اعتبار سے قدامت پسند ہیں۔"

مسلمانوں سے عصرِ جدید کے انسان کا مطالبہ

اسلام نے دورِ جدید کے انسان کے ذہن میں بہت سے سوالات پیدا کر دیئے ہیں اور وہ

مسلمانوں سے مطالبہ کر رہا ہے کہ وہ ان کا ایک ایسا جواب مہیا کریں جو مدلل اور حکیمانہ ہو اور اس قابل ہو کہ ایک ذہین اور تعلیم یافتہ آدمی کو قائل کر سکے۔ ان میں سے بعض سوالات یہ ہیں:-

(۱) کیا یہ بات درست نہیں کہ حقیقتِ کائنات مادّی ہے اور روح مادہ کی ایک خاصیت ہے جو اس وقت رونما ہوتی ہے جب مادہ اپنی ترقی اور ترکیب کی ایک خاص حالت پر پہنچ جاتا ہے۔

(۲) کیا یہ بات درست نہیں کہ مذہب فقط معاشی حالات کی پیداوار ہے اور خود اپنی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا۔

(۳) کیا انسان کی زندگی کا معاشی پہلو عمل تاریخ کا محرک نہیں اور کیا مذہب اس عمل تاریخ کی ایک عارضی حالت اور ضمنی یا اخلاقی پیداوار نہیں۔

(۴) کیا مذہب دبی ہوئی جبلتِ جنس یا رکی ہوئی حبِ تفوق یا اگی ہوئی نفرت اور قوت کی خواہش کا غیر فطری اور بے محل اظہار نہیں۔

(۵) کیا مذہب ایک ظالم سوسائٹی کا مصنوعی دباؤ نہیں جو اپنی سلامتی کی خاطر فرد کو مجبور کرتی ہے کہ وہ کچھ غیر فطری پابندیوں اور رکاوٹوں کو جنہیں وہ مذہبی اور اخلاقی اصولوں کا نام دیتی ہے اپنے آپ پر عائد کرے۔

(۶) کیا یہ درست نہیں کہ نیکی اور اخلاق ایک نسبتی اصطلاح ہے جس کے معنی مختلف قوموں کے لئے اور مختلف حالات کے اندر مختلف ہوتے ہیں۔

(۷) کیا یہ ممکن ہے کہ خدا کسی انسان پر وحی نازل کرے یا کوئی انسان سچ مچ نبی بن جائے۔

(۸) کیا نبوت (اگر وہ درحقیقت ممکن ہے) ایک ایسا عارضی واقعہ نہیں جو نوعِ انسانی کی تا قیامت ترقی کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

(۹) کیا انسان کی عقل اسے اپنا نیک و بد سمجھانے کے لئے کافی نہیں کہ کسی بیرونی راہ نمائی کی ضرورت ہو۔ جب انسان کو عقل دی گئی ہے تو اس نبوت کی خاص ضرورت کیا ہے۔

(۱۰) اگر نبوت کوئی ضروری چیز ہے تو یہ ختم کیوں ہو جاتی ہے اور تا قیامت انسان کی راہ نمائی کے لئے نئے نئے رہنما کیوں آتے نہیں رہتے۔ وغیرہ۔

ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم ان سوالات کا ایک ایسا جواب تلاش کریں جو نہ صرف اسلام کی بنیادی تعلیمات کے مطابق ہو بلکہ پوری طرح سے مدلل اور معقول اور علمیاتی (SCIENTIFIC) ہو۔ کم از کم ان تمام جوابات سے زیادہ معقول اور قابلِ قبول ہو جو دوسرے مذاہب یا نظریات کے ماننے والے ان ہی سوالات کے لئے پیش کر رہے ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب امتِ مسلمہ کے ضمیر نے بغیر واضح طور پر ہی سہی۔ لیکن اس بات کو محسوس کر لیا ہے کہ اگر ہم اس قسم کا جواب جو درحقیقت اسلام کی مکمل اور منظم حکمیاتی تشریح سے کم

نہیں ہوگی۔ فی الفور مہیا نہ کریں تو ایک نظریاتی جماعت کی حیثیت سے ہماری زندگی خطرہ میں ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس وقت قوم کے تعلیم یافتہ طبقہ میں اسلامی تحقیق کی ضرورت کا ایک عام احساس پیدا ہوگیا ہے۔

موجودہ دور کی ایک خصوصیت

اس زمانہ میں انسان کے نظریات بدنی اور جبلتی ضروریات کی سطح سے بالاتر ہو کر علمی اور اخلاقی سطح پر آگئے ہیں۔ اور لہٰذا نظریات کی حیثیت سے ان کی موجودگی پوری طرح سے نمایاں ہو گئی ہے۔ یہ زمانہ علمی نظریات کا زمانہ ہے اس دور میں اسلام کے سوائے باقی تمام نظریات کے حامیین اپنے اپنے نظریات کی علمی اور عقلی توجیہہ اور مدافعت بہم پہنچانے میں مصروف ہیں۔ کیونکہ وہ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو ان کی سیاسی زندگی بلکہ ہر قسم کی زندگی خطرہ میں رہے گی۔ نظریہ جو دراصل انسان اور کائنات کی حقیقت کے متعلق ایک عقیدہ یا وجدان یا ایمان کا نام ہے۔ تنہا وہ قوت ہے جو فرد اور جماعت اور ریاست کے تمام اعمال و افعال پر حکمران ہے۔ اگر یہ ثابت کیا جائے کہ وہ نظریہ حیات جس پر کسی ریاست کی بنیاد رکھی گئی ہے علمی طور پر صحیح اور عقلی طور پر اعتراضات سے بالا ہے۔ تو اس سے دو اہم نتائج برآمد ہوں گے۔ ایک یہ کہ اس سے ریاست کے ساتھ فرد کی کشش یا محبت بڑھ جائے گی اور ریاست کا اندرونی اتحاد ترقی پائے گا اور اس کی مستعدی عمل میں اضافہ ہوگا۔ اور اس کی قوت فروغ پاکر انتہا تک پہنچ جائے گی۔ اس کا دوسرا اہم نتیجہ یہ ہوگا کہ ریاست کی حدود کے باہر ریاست کے حامیوں اور مددگاروں کی تعداد روز بروز بڑھتی جائے گی۔ اور اس طرح سے اس کے سیاسی اثر و نفوذ کا حلقہ روز بروز وسیع ہوتا جائے گا۔ جس قدر کوئی نظریہ حیات زیادہ معقول و مدلل ہوگا۔ اور جس قدر زیادہ دل کش اور دل نشیں ہوگا اسی قدر زیادہ امکان اس بات کا ہوگا کہ وہ ترقی پاکر زمین کے کناروں تک پھیل جائے اور وہاں ہمیشہ کے لئے موجود رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نظریہ کے ماننے والے اس بات کی ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ وہ اس کی ایک بلند پایہ علمی اور عقلی تشریح پیدا کریں۔ اشتراکیت پہلے ہی ایک سائنسی نظریہ حیات ہونے کی مدعی ہے۔ ہٹلر کا نظریہ نیشنل سوشلزم۔ اس کی کتاب "میری جدوجہد" میں ایک فلسفہ کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ یہ ہیگل کے اس نظریہ کی ایک تشکیل جدید تھی کہ ریاست ایک خدا ہے جو بغیر محدود حقوق اور اختیارات رکھتی ہے اور اطاعت مطلقہ کی حق دار ہے۔ مسولینی کا نظریہ فسطائیت بھی اطالوی فلسفی کروچے کے فلسفیانہ نظام سے عقلی تائید اور توثیق حاصل کرتا تھا۔ امریکہ کے لوگ اب جمہوریت کو محض ایک طرز حکومت نہیں سمجھتے۔ بلکہ ایک فلسفہ زندگی سمجھتے ہیں اور بعض امریکی مصنفین نے اسے ایک فلسفہ زندگی کے طور پر پیش کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ بھارت کے لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کی ریاست گاندھی کے فلسفہ زندگی پر مبنی ہے۔

ایک نظریہ حیات غلط ہو یا صحیح لیکن وہ لوگ جو اس سے محبت رکھتے ہیں یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی نظریہ حیات دنیا میں حق ہے یا حق ثابت کیا جا سکتا ہے تو یہی ہے جب وہ اس کی عقلی اور علمی توجیہہ یا مدافعت کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کا مقصد درحقیقت یہ ہوتا ہے کہ وہ اس نظام حکمت کو آشکار کریں جو عقلی لحاظ سے دنیا کے تمام فلسفوں میں یکتا اور یگانہ ہے جو صرف ان کے نظریہ حیات کے اندر مخفی ہے اور دنیا بھر میں اور کہیں پایا نہیں جاتا۔ ہر نظریہ حیات کا ماننے والا اپنے نظریہ حیات کے متعلق ایسا ہی خیال رکھتا ہے۔ لیکن چونکہ حق صرف ایک ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ صرف ایک ہی فلسفہ ایسا ہو سکتا ہے جو درحقیقت صحیح اور معقول ہو۔ دو یا دو سے زیادہ فلسفے ایسے نہیں ہو سکتے: اس کا مطلب صاف طور پر یہ ہے کہ اپنی اپنی سائنسی توجیہہ اور تشریح کرنے کے لئے نظریات کی دوڑ میں صرف ایک نظریہ حیات کامیاب ہوگا اور وہی نظریہ حیات زندہ رہے گا اور پوری دنیا پر چھا جائے گا۔ اور باقی نظریات مٹ جائیں گے اور زندہ رہنے والے اس نظریہ حیات کے متعلق یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جائے گی کہ یہی انسان اور کائنات کا وہ آخری صحیح فلسفہ ہے جو عقل انسانی کی صبح کے طلوع سے لے کر آج تک تمام فلسفیوں اور سائنس دانوں کا سہانا خواب اور ان کی جستجو کا گوہر مقصود بنا رہا ہے۔ یہ باور کرنے کے لئے ہر دلیل موجود ہے کہ صرف اسلام ہی ایک ایسا نظریہ حیات ہے جو اس قابل ہے کہ انسان اور کائنات کی ایک عقلی علمی اور سائنسی تشریح کی صورت اختیار کر سکے۔ لیکن اب تک ہم نے کون سا کام کیا ہے جس سے یہ ثابت ہو جائے کہ ہمارا یہ عقیدہ فی الحقیقت درست ہے۔ اس معاملہ میں ہماری غفلت کو اس حقیقت نے اور زیادہ شگین اور خطرناک بنا دیا ہے کہ دوسرے نظریات کو ماننے والے لوگ اس وقت بھی دنیا کے اوپر یہ ثابت کرنے کے لئے بہت سا کام کر چکے ہیں کہ صرف ان کے نظریات ہی معقول اور مدلل ہیں۔ اور دنیا کا تعلیم یافتہ طبقہ یعنی نوع انسانی کا وہ حصہ جو درحقیقت کوئی اہمیت رکھتا ہے اور جس میں تعلیم یافتہ مسلمان بھی شامل ہیں۔ ہر روز زیادہ سے زیادہ تعداد میں ان کے ہزرنگ زمیں دام میں گرفتار ہوتا جا رہا ہے۔

اسلامی تحقیق کا کام ہمارے لئے زندگی اور موت کا سوال ہے

اقوام عالم ایک باہمی جنگ میں مصروف ہیں۔ جو کبھی پُرامن ہوتی ہے اور کبھی تشدد آمیز لیکن ہمیشہ ہمیشہ جاری رہتی ہے اس جنگ میں نظریات اور تصورات کی قوت ہی فیصلہ کن ثابت ہوگی۔ جو قوم اس جنگ میں فتح یاب ہو کر بالآخر دنیا کے کناروں تک پھیل جائے گی۔ اور پھر ہمیشہ وہاں موجود رہے گی۔ وہ وہ نہیں ہوگی جس

کے پاس جوہری آلات زیادہ ہوں گے، بلکہ وہ ہوگی جس کے نظریۂ حیات کے تصورات سب سے زیادہ معقول اور مدلل اور دل کش اور دل نشین ہوں گے۔ جو قوم نظریاتی محاذ پر اپنی حفاظت نہیں کرتی، وہ محض فوجی محاذ پر طاقتور بن کر اپنے آپ کو بچا نہیں سکتی۔ اور جو قوم نظریاتی محاذ پر طاقتور بن جائے اسے کسی فوجی محاذ کی ضرورت نہیں رہتی۔ اپنی زندگی کے اس نازک دور میں جب ہم دوسری قوموں کے نظریات کی طرف سے اپنی بقا کے لئے ایک خطرناک چیلنج کا سامنا کر رہے ہیں، ہم ایک نظریاتی قوم کی حیثیت سے صرف اسی صورت میں زندہ رہ سکتے ہیں جب ہم اسلام کی ایک نہایت ہی معقول اور مدلل سائنسی توجیہہ پیش کریں۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ تمام معقول اور دلکش سائنسی تصورات کا سرچشمہ توحید کا عقیدہ ہے۔ جو اپنی صحیح اور پاکیزہ صورت میں فقط ہماری قوم ہی کے پاس ہے۔ یہی وہ عقیدہ ہے جو اسلام کی روح ہے اور انسان اور کائنات کے صحیح اور سائنسی نظریہ کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم تحقیق و تجسس کی تمام قوتوں کو بروئے کار لا کر اسلامی تعلیمات کو ایک ایسے سائنسی نظریہ کائنات کی شکل دیں، جس سے انکار کی گنجائش موجود نہ رہے۔ ہمارے اسلامی تحقیق کے تمام اداروں کو اس اہم کام کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔ اسلامی تحقیق ہمارے لئے کوئی غیر ضروری تفریحی مشغلہ نہیں جسے ہم اپنی فرصت یا سہولت کے مطابق اختیار کریں یا نہ کریں۔ بلکہ ہماری زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اگر ہم اس کی طرف بروقت اور پوری توجہ کے ساتھ متوجہ نہ ہوئے تو ہمیں یقینی موت کا منتظر رہنا چاہیئے اور پھر ہمارے بعد خدا کوئی اور قوم پیدا کرے گا جو اسلام کا یہ کام کرے گی۔ (جاری)

تحریکِ جماعتِ اسلامی

ایک تحقیقی مطالعہ

تالیف ڈاکٹر اسرار احمد ایم اے، ایم بی بی ایس

سابق ناظم اعلیٰ اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان و امیر جماعت اسلامی منٹگمری

• ضخامت ۲۳۶ صفحات • سائز بڑا • طباعت آفسٹ • مجلد مع گرد پوش

قیمت ۴ روپے۔ علاوہ محصول ڈاک

دارالاشاعت الاسلامیہ، کوثر روڈ، اسلام پورہ، لاہور ۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

برصغیر میں تبلیغِ عیسائیت کی تاریخ

سنہ ۱۹۶۱ء میں پاکستان میں جو مردم شماری ہوئی تھی اس کے نتیجے میں پاکستان میں عیسائی آبادی جس تیزی کے ساتھ بڑھی ہے اس کے اعداد و شمار سامنے آئے تو ایک بار پورے ملک کے مذہبی طبقے میں بےچینی سی پیدا ہو گئی ــــــ اس موقع پر پروفیسر صاحب نے ایک مقالہ تحریر فرمایا تھا جس کے پہلے حصے میں برصغیر میں تبلیغ عیسائیت کی مختصر تاریخ بیان کی اور دوسرے حصے میں اس بڑھتی ہوئی رَو کو روکنے اور اس کا رخ موڑنے کے لئے کچھ عملی تجاویز پیش کیں۔ مقالے کا پہلا حصہ ایک مستقل علمی مضمون ہے جو افادۂ عام کے لئے 'میثاق' میں شائع کیا جا رہا ہے ــــ دوسرے حصے کی اشاعت صرف اسی صورت میں مفید ہو سکتی ہے کہ کچھ دردمند لوگ اس کے لئے عملی جد و جہد کے لئے آمادہ ہوں، اور چونکہ فی الحال ایسی کوئی صورت عملاً سامنے موجود نہیں، لہٰذا اس کی اشاعت بے کار ہے ــــــ (اسرار احمد)

سنہ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری سے یہ حقیقت مسلمانوں کے سامنے واضح ہو گئی ہے کہ گزشتہ دس سال میں پاکستان کے عیسائیوں کی تعداد میں ۲۰ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ جب سے یہ بات مسلمانوں کو معلوم ہوئی ہے ان میں سے جو مسلمان دل میں اپنی قوم کا درد رکھتے ہیں اور اسلام سے محبت رکھتے ہیں وہ بہت پریشان ہیں بلکہ انہیں یہ خطرہ لاحق ہو گیا ہے کہ اگر عیسائیوں کی تعداد میں اضافے کی یہی رفتار قائم رہی تو پچاس سال کے بعد عیسائی اس ملک میں ایک عنصر غالب اور اہم طاقت بن جائیں گے اور اسلام جس کے فروغ کے لئے انہوں نے لاکھوں مسلمانوں کی قربانی دی تھی اپنے ہی وطن میں غیروں کے رحم و کرم کا محتاج ہو جائے گا۔

یہ خطرہ فرضی یا وہمی نہیں بلکہ حقیقی اور واقعی ہے۔ پاکستان کی سیاست سے قطع نظر ایک مسلمان کا یہی فکر کا

آغوش میں چلا جانا، مسلمانوں کے لئے ناقابل برداشت ہے۔ اس لئے ہمیں نہایت توجہ کے ساتھ اس مسئلے پر غور کرنا چاہیئے کہ پاکستان میں عیسائیت کے اس غیر معمولی فروغ کے اسباب کیا ہیں اور ہمیں اس خطرے کا سدباب کرنے کے لئے کیا کرنا چاہیئے۔

واضح ہو کہ عیسائیت کی ترقی کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے بلکہ لازمی نتیجہ ہے اس تبلیغی نظام کا جو عیسائیوں نے آج سے دو سو سال پہلے اس برصغیر میں قائم کیا تھا۔ اس نظام کی جڑیں ہماری تعلیمی اور ثقافتی، تمدنی اور اقتصادی زندگی کی زمین میں بہت مستحکم ہو چکی ہیں۔ ہم ڈیڑھ سو سال تک انگریزوں کے بلا واسطہ غلام رہ چکے ہیں اور اگرچہ ہمیں پندرہ سال سے سیاسی آزادی مل چکی ہے مگر ذہنی طور پر ہم ابھی تک انگریزوں کے غلام ہیں اور یہ ذہنی غلامی سیاسی غلامی سے بھی زیادہ خطرناک اور مضرت رساں ہوتی ہے۔ سیاسی غلامی کی وجہ سے ہم عیسائیت کی ترقی کو کسی طرح نہیں روک سکتے تھے۔ اب جبکہ ہم سیاسی طور سے آزاد ہو چکے ہیں تو اگر بحیثیت قوم کوشش کریں تو یہ سیلاب ضرور رک سکتا ہے اس لئے ہمیں سب سے پہلے عیسائیت کی دو صد سالہ تبلیغی جد و جہد کی تاریخ پر نظر ڈالنی ضروری ہے تاکہ ہم اس کا مقابلہ کرنے کے لئے مناسب حال تیاری کر سکیں۔ زخم کا علاج کرنے سے پہلے ڈاکٹر، پروب (PROBE) ڈال کر زخم کی گہرائی کا اندازہ کرتے ہیں اس کے بعد معالجہ شروع ہوتا ہے۔

واضح ہو کہ وہ خطہ جسے ہم پاکستان کہتے ہیں، ۱۹۴۷ء تک ہندوستان کا ایک حصہ تھا اس لئے ہمیں ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغی کوششوں کا مطالعہ کرنا ہوگا۔

۱۵۱۰ء میں پرتگال بیڑے کے کمانڈر البوکرک نے گوا پر قبضہ کیا۔ یہ ساحلی علاقہ اس وقت بیجا پور کی مملکت میں واقع تھا۔ مگر ہندوستان کے حکمرانوں نے بحری طاقت کی طرف کبھی توجہ ہی نہیں کی اس لئے بیجا پور کی حکومت پرتگالیوں سے بازپرس نہ کر سکی اور جب انہیں یہ اندازہ ہو گیا کہ حکومت معذور و مجبور ہے تو پرتگالیوں نے ۱۵۱۷ء سے لے کر ۱۵۶۰ء تک گوا (گوا) کی تمام آبادی کو بزور شمشیر عیسائی بنا لیا اور چونکہ یہ کام عیسائی اس سے کچھ عرصہ پہلے پرتگال اور اسپین میں کر چکے تھے۔ اس لئے یہاں انہیں کیا تامل ہو سکتا تھا؟

۱۵۸۰ء میں اکبر مرتد نے گوا کے پادریوں کو بصد احترام اپنے دربار میں مدعو کیا۔ اور انہیں اسلام پر اعتراضات کرنے کی اجازت دی۔ اس بات سے ان کے حوصلے بڑھ گئے۔ یعنی خود اکبر مرتد نے انہیں اپنی مملکت میں عیسائیت کی تبلیغ کی اجازت دی اور ان کے لئے راہ ہموار کی چنانچہ اکبر مرتد نے ۱۵۹۵ء میں آگرے میں اور ۱۵۹۹ء میں لاہور میں گرجا تعمیر کرنے کی اجازت دی گویا ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ کا تخم خود اکبر نے بویا جسے سارے مؤرخین مسلمان سمجھتے ہیں[1]

[1] حاشیہ اگلے صفحہ پر

جہانگیر نے پادریوں کی حوصلہ افزائی نہیں کی اس لئے لاہور کا گرجا تو کچھ عرصے کے بعد بند ہو گیا۔ مگر آگرے کا گرجا قائم رہا اور چار سو سال سے آگرہ، رومن کیتھولک فرقے کے عیسائیوں کا مرکز چلا آ رہا ہے۔

شاہجہان کے عہد میں پادریوں کو یقین ہو گیا کہ مغلیہ حکومت میں ہمیں کامیابی نہیں ہوگی اس لئے وہ لوگ گوا واپس چلے گئے۔

سترھویں صدی میں انگلستان، فرانس اور ڈنمارک نے ہندوستان سے تجارت کا سلسلہ شروع کیا ۱۶۱۶ء میں ڈنمارک میں تجارتی کمپنی قائم ہوئی جس نے جنوبی ہند کے ساحلی شہروں میں اپنے تجارتی مرکز قائم کئے اور ۱۷۰۶ء میں ڈنمارک نے ہندوستان میں پروٹسٹنٹ فرقے کے پادریوں کو تبلیغ کے لئے بھیجا۔ گویا ڈینش مشن سے ہندوستان میں از سر نو عیسائیت کی تبلیغ کی جد و جہد شروع ہوئی اور چونکہ سلطنت مغلیہ روبزوال تھی اور ۱۷۵۷ء میں مغلیہ حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ اس لئے مغربی طاقتوں کو سیاسی اقتدار حاصل ہونا شروع ہو گیا۔ یعنی تجارتی کمپنیاں حکومت میں دخیل ہونے لگیں اس لئے ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ کے لئے راستہ صاف ہو گیا۔ مگر اٹھارویں صدی میں عیسائی پادریوں نے صرف ہندوؤں میں اپنے مذہب کی اشاعت کی۔ مسلمانوں کو عیسائی بنانے کا سلسلہ شروع نہیں کیا اور یہ بات ان کی دانائی اور دور اندیشی کی دلیل ہے اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ فرنگی اقوام کس قدر دور اندیش ہیں! اور انہوں نے تبلیغ کا کام کس قدر دانائی اور عاقبت بینی کے ساتھ انجام دیا!

چنانچہ پادریوں نے جنوبی ہند کے ہندوؤں سے مناظرے شروع کئے اور ۱۷۱۴ء میں ٹرنکوبار کے پنڈتوں سے عیسائیوں کا پہلا مناظرہ ہوا۔ یہ ہندوستان میں مذہبی مناظروں کی ابتدا تھی۔ مسلمانوں نے اپنی چھ سو سال کی حکومت میں ہندوؤں سے کوئی مناظرہ نہیں کیا (تبلیغی جذبہ ختم ہو چکا تھا) مگر عیسائیوں نے اس سرزمین میں قدم رکھتے ہی مناظروں کا

[1] شاید بعض لوگوں کو لفظ "مرتد" سے حیرانی لاحق ہو لہٰذا اس کے ازالے کے لئے یہ صراحت ضروری ہے کہ جب ۳۶۱ء میں جولین (JULIAN) قیصر روم نے تخت نشینی کے بعد عیسائی مذہب ترک کر دیا تو عیسائی مؤرخین نے اس کے نام کے ساتھ THE APOSTATE یعنی "المرتد" کا اضافہ کر دیا۔ اور جتنی تاریخیں لکھی گئیں، سب میں یہ لفظ بالالتزام اس کے نام کے ساتھ شامل کیا گیا یعنی اس طرح عیسائی مؤرخین نے اپنی دینی حمیت کا ثبوت دیا۔ اسی جذبے کے تحت میں نے بھی اکبر کے نام کے ساتھ یہ لفظ شامل کر دیا ہے کیونکہ اس نے بھی اسلام ترک کر کے دین الٰہی اختیار کر لیا تھا جسے اس نے خود ایجاد کیا تھا۔ چنانچہ جب اس نے راجہ مان سنگھ کو اس دین کی دعوت دی تو غیرت مند راجہ نے اسے یہ تاریخی خط لکھا تھا کہ آپ حکم دیں تو میں مسلمان ہو سکتا ہوں لیکن آپ کے ایجاد کردہ دین کو تسلیم نہیں کر سکتا کیونکہ میری نگاہ میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔

بازار گرم کر دیا۔

عیسائیوں کو ان مناظروں میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی اور جنوبی ہند کے ہندو بتدریج عیسائیت قبول کرنے لگے۔ دو سو سال کی مسلسل جد و جہد کی بدولت آج جنوبی ہند کی نصف آبادی عیسائی ہے۔

پادریوں نے بڑے بڑے شہروں میں مدارس قائم کئے اور ہندوؤں کے بچوں کو مفت تعلیم دینے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں انگریزوں کو جنوبی ہند میں سیاسی استحکام نصیب ہو گیا تو انہوں نے پادریوں کی حوصلہ افزائی شروع کر دی۔ چنانچہ جب مدراس کے گورنر نے سلطان حیدر علی کے پاس سفارت بھیجی تو تنخواہ دار پادری شوارز جو فارسی دان تھا، بحیثیت سفیر سلطان کے پاس آیا تھا۔ یعنی عیسائی پادری تبلیغ بھی کرتے تھے اور بوقت ضرورت سفارت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے اس طرح عوام پر انہیں غیر معمولی اقتدار حاصل ہو گیا۔

متاعِ غیر پہ ہوتی ہے جب نظر اس کی
تو ہیں ہراولِ لشکر کلیسا کے سفیر (اقبال مرحوم)

جب لارڈ کارنوالس نے یہ دیکھا کہ اب بنگال پر ہمارا قبضہ مستحکم ہو چکا ہے تو اس نے ۱۷۹۰ء میں پادریوں کو بنگال میں عیسائیت کی تبلیغ کی اجازت دے دی۔ چنانچہ ۱۷۹۳ء میں ولیم کیری پہلا عیسائی پادری مبلغ کی حیثیت سے کلکتہ میں آیا اور اس نے پادری مارشمین اور پادری الگزنڈر ڈف کی مدد سے عہد جدید کا ترجمہ بنگلہ زبان میں تیار کیا۔

طباعت کا مسئلہ یوں آسان ہو گیا کہ ڈنمارک مشن کے پادریوں نے ۱۷۹۹ء میں سیرامپور (بنگال) میں ایک شاندار کالج قائم کیا تھا جس میں پادریوں کو بنگلہ اور فارسی زبانیں پڑھائی جاتی تھیں۔ تاکہ وہ یہاں کے باشندوں میں ان کی زبان میں تبلیغ کر سکیں۔ اس کالج کے ساتھ ایک مطبع بھی قائم کیا گیا تھا اور اب ۱۷۹۲ء میں اسی مطبع میں بائبل کا ترجمہ ٹائپ میں شائع کیا گیا۔

یہ وضاحت اس لئے کر رہا ہوں تاکہ مسلمانوں کو یہ معلوم ہو سکے کہ مذہب کی اشاعت کے لئے کس قدر انہماک اور تیاری ضروری ہے۔

۱۷۹۱ء میں سارے ہندوستان میں تین ہزار دیسی عیسائی تھے لیکن آج ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کی رو سے ہندوستان میں ان کی تعداد ایک کروڑ سے بھی تجاوز ہے۔ یہ لوگ جادو کے زور سے عیسائی نہیں بنائے گئے بلکہ پادریوں کی انتھک کوششوں کی بدولت عیسائی بنے ہیں!

جب ۱۷۹۹ء میں سلطان ٹیپو نے جام شہادت نوش کیا۔ وہی ٹیپو جس کے بارے میں علامہ اقبال نے یہ لکھا ہے:

آں کہ گفتارش ہمہ کردار بود
مشرق اندر خواب و او بیدار بود (جاوید نامہ)

تو انگریزوں کو نظر آ گیا کہ اب ہندوستان میں کوئی مسلمان ایسا باقی نہیں رہا جو ہمارا مقابلہ کر سکے۔ نظام حیدرآباد ہمارا کفش بردار ہے اور شاہ اودھ ہمارے پنجے میں گرفتار ہے۔ رہا شاہ عالم ثانی تو وہ خود ہی مرہٹوں کا غلام ہے۔

یہ دیکھ کر سرکار کمپنی بہادر نے پادریوں کو مسلمانوں میں بھی تبلیغ عیسائیت کی اجازت دے دی۔ چنانچہ ۱۸۰۴ء میں انگلستان میں انجیل کی اشاعت کے لئے ایک سوسائٹی قائم ہوئی جسے عرف عام میں ایس پی جی کہتے ہیں۔ اور اس سوسائٹی نے ۱۸۰۵ء میں مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لئے پہلا پادری ہندوستان روانہ کیا۔ اس کا نام پادری ہنری مارٹن[1] تھا۔ یہ پادری ۱۸۰۶ء میں کانپور پہنچا اور اس نے ۱۸۰۸ء میں عہد جدید (NEW TESTAMENT) کا ترجمہ فارسی زبان میں مکمل کر دیا جو ۱۸۰۹ء میں سیرامپور کے مشن پریس سے شائع ہوا۔[2]

اس پادری نے ۱۸۱۲ء میں ایک مسلمان کو عیسائی بنایا اور اس کا نام عبد المسیح رکھا گیا۔ ہندوستان میں یہ شخص پہلا مسلمان تھا جو "بپتسمہ کی برکت" سے سرفراز ہوا۔ چونکہ شمالی ہند میں اس وقت صرف آگرہ ہی ایک ایسا شہر تھا، جہاں اکبر مرحوم کی بدولت رومن کلیسا کا گرجا بھی تھا اور عیسائیوں کی آبادی بھی تھی اس لئے چرچ مشنری سوسائٹی نے عبد المسیح کو پادری بنا کر آگرے میں متعین کر دیا۔ یہاں اس شخص نے دنیاوی عروج بھی حاصل کیا اور اپنے نام پر ایک محلہ بھی آباد کیا۔ چنانچہ "عبد المسیح کا کٹرا" آج بھی آگرے میں موجود ہے۔

۱۸۲۳ء میں جب کلیسائے انگلستان کے لاٹ پادری (اسقف اعظم) آنریبل بشپ ہیبر (HEBER) نے تبلیغی زاویہ نگاہ سے کلکتے سے بمبئی کا سفر طویل اختیار کیا تھا تو آگرے میں عبد المسیح کو بھی شرف ملاقات بخشا تھا۔ اور اس کے خلوص اور تبلیغی کارناموں کا ذکر اپنے مشہور عالم سفرنامے میں بھی کیا تھا۔

بشپ ہیبر نے ۱۸۲۳ء میں سرکار کمپنی کے ڈائرکٹروں کو یہ رپورٹ دی کہ سارے ہندوستان میں ہمارا سیاسی اقتدار قائم ہو چکا ہے۔ مسلمان، مرہٹے، راجپوت اور سکھ سب ہمارے سامنے سربسجود ہیں۔ اس لئے مسلمانوں میں تبلیغ کی

---

[1] اسی پادری کے نام پر عیسائی جماعتوں نے ۱۹۳۰ء میں لاہور میں صرف مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لئے ایک مدرسہ تدریب المبلغین قائم کیا تھا۔ اس کا نام تھا "ہنری مارٹن سکول آف اسلامک اسٹڈیز"۔ یہ کالج اب علی گڑھ میں منتقل ہو گیا ہے۔ ۱۲

[2] مسلمانوں کو حیرت سے سر پکڑ لینا چاہیے بشرطیکہ صلاحیت باقی رہ گئی ہو، کہ انگریزوں نے سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے بعد فوراً انجیل کا ترجمہ بنگلہ اور فارسی میں شائع کر دیا۔ لیکن مسلمانوں نے اس ملک میں چھ سو سال تک حکومت کی مگر قرآن کریم کا ہندی زبان میں کوئی ترجمہ شائع نہیں کیا۔ یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء میں تاج محل اور شالامار بنانے والوں کی اولاد صفحہ ہستی سے مٹا دی گئی۔ ۱۲

جائے تو کوئی ہنگامہ یا شورش برپا نہیں ہوگی۔

چنانچہ ۱۸۳۲ء میں یوحنّوی کلیسا یا شاہی کلیسا (چرچ آف انگلینڈ)[1] کی طرف سے ڈاکٹر سی جی فینڈر (PFANDER) جو جرمن نژاد پادری تھا اور عربی فارسی دونوں زبانوں میں تحریر و تقریر پر قادر تھا۔ نیز قسطنطنیہ اور شیراز میں عیسائیت کی تبلیغ کر چکا تھا، ہندوستان آیا اور اس نے ۱۸۳۵ء میں فارسی زبان میں اسلام کی تردید میں ایک کتاب شائع کی جس کا نام "میزان الحق" تھا۔ اسلام کی تردید میں یہ پہلی کتاب تھی جو ہندوستان میں شائع ہوئی اس سے پہلے کسی مذہب کے پیرو نے اسلام کے خلاف کوئی کتاب نہیں لکھی تھی۔ یا یوں سمجھو کہ کسی کو اس بات کی جرأت نہ ہوئی تھی کہ اسلام کے خلاف لب کشائی کرسکے۔ مسلمانوں نے اس کتاب کے کئی جواب لکھے۔ اور ۱۸۳۵ء سے ۱۸۵۵ء تک مسلسل مباحثوں کا بازار گرم رہا۔ ۱۸۵۵ء میں ڈاکٹر فینڈر اور حضرت مولانا رحمت اللہ[2] صاحب کیرانوی مرحوم کے درمیان آخری مناظرہ ہوا جس میں پادری فرنچ، فینڈر کا مددگار تھا۔ اور ڈاکٹر وزیر خاں اسسٹنٹ سرجن آگرہ مولانا کے مددگار تھے۔ اس مناظرے کی روداد "مراسلات مذہبی" کے نام سے ۱۸۵۵ء میں کانپور سے شائع ہوئی تھی اور ۱۹۲۳ء میں میری نظر سے گذری تھی۔ اس مناظرے میں فینڈر کو ایسی شکست ہوئی کہ وہ ہندوستان چھوڑ کر چلا گیا۔

جب ۱۸۳۲ء میں رنجیت سنگھ نے انگریزوں سے دوسرا عہد نامہ کیا (پہلا عہد نامہ ۱۸۰۹ء میں ہوا تھا) تو ۱۸۳۴ء میں پادریوں کو حوصلہ ہوا کہ پنجاب کی سرزمین کو بھی عیسائیت کے نور سے روشن کریں چنانچہ ۱۸۳۴ء میں لدھیانے میں مشن اسکول اور مشن ہسپتال قائم ہوا۔ اور جب ۱۸۴۹ء میں اللہ تعالیٰ نے پورا پنجاب معہ ڈیرہ جات، اپنے فضل و کرم سے انگریز کی جھولی میں ڈال دیا اور رنجیت سنگھ کے جانشین دلیپ سنگھ نے اپنا ملک ہی انگریزوں کے حوالے نہیں کیا بلکہ "کوہ نور" بھی بخوشی نذر کر دیا اور لندن پہنچ کر بپتسمہ بھی لے لیا، تو اسی سال یعنی ایک مہینے

[1] انگلستان کے بادشاہ کے لئے اس کلیسا کا پیرو ہونا لازمی ہے۔ اگر وہ دوسرا عقیدہ اختیار کرے تو تاج سے محروم ہو جائے گا۔ نیز اس فرقے کی حمایت اس پر فرض ہے۔ یعنی ملکۂ انگلستان کا لقب "حامیۂ دین عیسوی" بھی ہے اور وہ اس پر فخر کرتی ہے۔

[2] مولانا مرحوم نے عیسائیت کی تردید میں کئی کتابیں فارسی میں لکھی تھیں جن میں سے "ازالۃ الاوہام" بہت مشہور ہوئی اور عربی میں "اظہار الحق" لکھی تھی جسے بلادِ اسلامیہ میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ مولانا مرحوم ۱۸۵۷ء کے بعد ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے تھے۔ فینڈر سے ایک مناظرہ قسطنطنیہ میں بھی ہوا، سلطان روم نے انہیں سونے کا تمغہ عنایت کیا تھا۔ ۱۲

کی تاخیر کے بغیر خاص شہر لاہور میں رنگ محل میں پادریوں نے تبلیغی مرکز قائم کر دیا۔ — اسے کہتے ہیں چستی و چالاکی اور موقع شناسی کہ جس دن ملک قبضے میں آیا اسی دن تبلیغ دین عیسوی کا سنگ بنیاد بھی رکھ دیا گیا۔ مسلمانوں کی طرح نہیں کہ ہندوستان پر قبضہ ۱۲۰۶ء میں ہوا مگر تبلیغ اسلام کا نظام ۱۹۶۶ء میں بھی قائم نہ ہوا اور ابھی تک کہیں قائم نہیں ہو سکا ہے۔ شیخ سعدی کا مصرع بادنیٰ تغیر ہمارے حال پر صادق آتا ہے۔

"آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں
بر زوالِ ذوق و شوق و جذبۂ تبلیغ دیں"

۱۸۵۷ء کے بعد جو حالات ہندوستان کے طول و عرض میں رونما ہوئے انہوں نے پادریوں کی ہمت افزائی بھی کی اور تبلیغ کے نئے سہولتیں بھی پیدا کیں۔ چونکہ حکومت ان کی پشت پناہی اور مالی امداد کرتی تھی، اس لئے پادری کو وہ اقتدار حاصل ہو گیا کہ پنجاب کے تھانے دار اور تحصیل دار بھی اسے جھک کر سلام کرتے تھے۔

حکومت کی طرف داری اور حوصلہ افزائی کا اندازہ اس بات سے ہو جاتا ہے کہ سر ولیم میور لفٹیننٹ گورنر یوپی نے اسلام کے خلاف کئی کتابیں لکھیں۔ سر ہنری لارنس اور سر جان لارنس دونوں بھائی مذہب عیسوی کے مبلغ تھے۔ ایک پنجاب کا چیف کمشنر تھا، دوسرا ہندوستان کا وائسرائے۔ ایڈورڈس، منٹگمری، لائل، میکلوڈ، فٹز پیٹرک، ایبٹ، ایچیسن، یہ سب لوگ حکمران بھی تھے اور مبلغین و حامیان دین عیسوی بھی تھے اسی لئے پنجاب میں پادریوں کو سب صوبوں سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی۔ اس انتخاب ہفت کشور یعنی پنجاب کا کوئی شہر ایسا نہیں ہے جہاں کے مسلمان جوق در جوق عیسائی نہ ہوئے ہوں، تفصیل سے قصداً اجتناب کرتا ہوں۔

چونکہ پادریوں کو پریس کی سہولت حاصل تھی۔ مطابع ان کے اپنے تھے۔ اس لئے ۱۸۶۳ء سے انہوں نے ہندوستان کے طول و عرض میں تبلیغی اخباروں، رسالوں، پمفلٹوں اور ٹریکٹوں کی بھرمار کر دی اس مقصد کے لئے پادریوں نے لاہور، الہ آباد، کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں عیسائیت پر لٹریچر شائع کرنے کے لئے "عالیشان مرکز قائم کئے۔ چنانچہ لاہور میں پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی ۱۸۶۳ء میں قائم ہوئی تھی۔ صرف کرسچین لٹریچر سوسائٹی مدراس نے ہندوستان کی مختلف زبانوں میں جس قدر کتابیں شائع کیں ان کی تفصیل بیان کرنے کے لئے ایک مستقل کتاب درکار ہے۔ صدہا پادریوں نے اپنی زندگیاں صرف کتابیں لکھنے کے لئے وقف کر دیں۔ ہندوستان میں کشمیر سے لے کر ٹراونکور تک اور بلوچستان سے لے کر برما تک جس قدر زبانیں مروج ہیں، سب میں بائبل کا ترجمہ مل سکتا ہے اور سب زبانوں میں عیسائیت پر لٹریچر موجود ہے۔ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی نے اب تک دنیا کی ہر زبان میں بائبل کا ترجمہ شائع کر دیا ہے۔ تاکہ کوئی شخص یہ نہ کہہ سکے کہ میں بائبل نہیں پڑھ سکتا۔ صرف ایک بات کہہ کر اس داستان کو ختم کرتا ہوں۔

ہندوستان میں جو شخص میٹرک پاس کرتا تھا اسے بائبل سوسائٹی کی طرف سے ہر سال انگریزی میں عہد جدید کا

نسخہ بلا قیمت روانہ کیا جاتا تھا، اور جو شخص بی اے پاس کرتا تھا اسے پوری بائبل مفت دی جاتی تھی۔ یہ سلسلہ ۱۸۷۲ء سے تقسیم ہند تک جاری تھا۔

پادریوں نے ہندوستان کے طول و عرض میں یتیم خانے، شفا خانے، پرائمری سکول، مڈل سکول، کالج اور دار المبروص، دار الاپاہج، زراعتی آبادیاں، فروٹ فارم، انجمن ہائے امداد باہمی، بنک، چھاپے خانے، ٹریننگ سکول، تبلیغی کالج، تبلیغی مدارس، عیسائی آشرم، ٹی بی کی صحت گاہیں، دار الاطفال، دار النسواں، مراکز مطالعہ، کتب خانے، وائی ایم سی اے اور وائی ڈبلیو سی اے، دار الصحت، پادریوں کے لئے آرام گاہیں، طلبہ کے لئے ہوسٹل، مراکز تعلیم بائبل، سیوا شنگھ، پریم سبھائیں اور کانورٹس ہوم یعنی ان لوگوں کے لئے دار القیام جو اپنا مذہب ترک کرکے دین عیسوی قبول کریں، قائم کئے۔ الغرض پادریوں نے غیر عیسائی افراد تک پہنچنے اور انہیں اپنے قریب لانے اور ان سے روابط پیدا کرنے اور انہیں متاثر کرنے کے لئے جس قدر ذرائع ممکن ہو سکتے ہیں وہ سب اختیار کئے ہیں اور یہ کام گزشتہ ڈیڑھ سو سال سے نہایت باقاعدگی سے ہو رہا ہے۔ صرف لاہور شہر میں عیسائیوں کی تبلیغی جماعتوں اور ان کی سرگرمیوں کی تفصیل کے لئے ایک مستقل کتاب درکار ہے۔ سینکڑوں تبلیغی جماعتیں نہایت خاموشی کے ساتھ تبلیغ میں مصروف ہیں اور آپس میں کبھی مناظرے نہیں کرتیں۔ کیونکہ وہ جانتی ہیں کہ اس طرح وہ اپنے مقصد سے دور ہو جائیں گی۔ جیسے کسی شخص کے دو دل نہیں ہوتے رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں کے عقائد میں بعد المشرقین ہے۔ اول الذکر فرقہ آخر الذکر کو عیسائیت سے خارج یقین کرتا ہے۔ اس کے باوجود آج تک ان میں کوئی مناظرہ یا مباحثہ نہیں ہوا۔ خود پروٹسٹنٹ فرقے میں بہت سے فرقے ہیں، مگر یہ بھی آپس میں کبھی مناظرہ نہیں کرتے۔ وجہ پہلے بیان کر چکا ہوں کہ پھر یہ جماعتیں جھگڑوں میں تبلیغ نہیں کر سکیں گی۔

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیلؑ
خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز

— اقبالؒ

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

صوفیائے متقدمین کا اجمالی تذکرہ

(۲)

(۱۲) فضیل ابن عیاضؒ — م ۱۸۷ھ

فضیل ابن عیاض تمیمی رحمۃ اللہ مرو کے قریب ایک گاؤں فندین میں پیدا ہوئے تھے۔ صاحب طبقات الصوفیہ نے ان کے حسب ذیل اقوال نقل کئے ہیں:۔

(ا) جو شخص اہل بدعت کی صحبت میں رہتا ہے اسے حکمت عطا نہیں کی جاتی۔

(ب) اللہ ان لوگوں سے راضی ہوتا ہے جو اس کی معرفت حاصل کریں۔

(ج) حامل قرآن کو مخلوقات کی حاجت نہیں رہتی بلکہ مخلوقات اس کی محتاج ہوتی ہیں (حامل قرآن سے مراد وہ شخص ہے جو قرآن کو اپنا ہادی بنائے)

(د) زہد کی اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ زاہد سے راضی ہو جائے۔

(ہ) تین باتوں سے قلب میں قساوت پیدا ہو جاتی ہے۔ زیادہ کھانے سے، زیادہ سونے سے اور زیادہ باتیں کرنے سے۔

(و) اللہ تعالیٰ متقی لوگوں کو وہاں سے رزق پہنچاتا ہے جہاں ان کا گمان بھی نہیں پہنچ سکتا۔

(ز) خوشخبری ہے اس شخص کے لئے جو انسانوں کے بجائے اللہ سے محبت کرے۔

(ح) اگر دشمن تمہاری غیبت کرے تو وہ تمہارے حق میں دوست سے بھی زیادہ مفید ہے کیونکہ جب وہ تمہاری غیبت کرے گا تو اس کی نیکیاں تمہارے نامہ اعمال میں درج کر دی جائیں گی۔

(۱۳) شقیق بلخیؒ — م ۱۹۴ھ

ابراہیم ادہمؒ کے مرید ہیں اور حاتم اصم کے مرشد ہیں۔ یہ پہلے صوفی ہیں جنہوں نے یہ کہا کہ توکل تصوف کے احوال میں سے ایک حال ہے۔ ان کا قول ہے کہ توکل کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ تجھ سے کیا ہے تیرا دل

اس پر مطلق ہو جاتے۔ مسلک تصوف اختیار کرنے سے پہلے انہوں نے امام ابو حنیفہ رح اور ان کے بعد امام زفر سے علم فقہ حاصل کیا تھا ان کا قول ہے کہ لوگوں کے پاس بیٹھو مگر اس طرح جیسے آگ کے پاس بیٹھتے ہو کہ اس سے منفعت تو حاصل کرتے ہو مگر اس کی مضرت سے اجتناب کرتے ہو۔

صاحب طبقات الصوفیہ نے لکھا ہے کہ ان کا نام ابو علی شقیق بن ابراہیم الازدی تھا۔ بلخ کے رہنے والے تھے۔ ان کا قول ہے کہ انسان کا تقویٰ تین باتوں سے معلوم ہو سکتا ہے (۱) وہ کیا اختیار کرتا ہے (۲) کسے ترک کرتا ہے۔ (۳) کیا کہتا ہے! نیز یہ کہ زاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے اپنے زہد کو قائم کرتا ہے۔ نیز یہ کہ میں نے بیس سال تک قرآن میں غور کیا یہاں تک کہ دنیا اور آخرت میں تمیز کر لی اور اس کو میں نے دو حرفوں میں پایا اور اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے:۔

وَمَا اُوْتِیْتُمْ مِنْ شَیْءٍ فَمَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ زِیْنَتُهَا وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰی

"جو کچھ تم کو دیا گیا ہے وہ محض (چند روزہ) دنیوی زندگی کے برتنے کے لئے ہے اور (یہیں کی) زیب و زینت ہے اور جو (ثواب) اللہ کے ہاں ہے وہ بدرجہا اس سے بہتر ہے اور زیادہ (یعنی ہمیشہ) باقی رہنے والا ہے" (۲۸-۶۰)

نیز یہ کہ اغنیا سے بچتے رہو کیونکہ اگر تم ان سے ملو گے تو رفتہ رفتہ ان سے مالی فائدوں کی طمع کرنے لگو گے اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم انہیں اربابًا من دون اللہ بنا لوگے اور مشرک ہو جاؤ گے۔ شقیق نے ۱۹۴ھ میں وفات پائی۔

(۱۴) معروف کرخیؒ ——— م ۲۰۰ھ

پورا نام ابو محفوظ معروف بن فیروز الکرخی تھا۔ ورع اور فتوت کے لئے مشہور تھے۔ سری سقطی کے مرشد اور استاد تھے۔ داؤد طائی کے ہم نشین تھے۔ شیعوں کے امام علی بن موسیٰ الرضا کے ہاتھ پر اسلام لائے تھے۔ ان کا قول ہے کہ جب اللہ کسی بندے کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے لئے عمل کا دروازہ کھول دیتا ہے اور جدال کا دروازہ بند کر دیتا ہے۔ نیز یہ کہ "بندے پر اللہ کی ناراضگی کی علامت یہ ہے کہ وہ لایعنی امور میں مشغول ہو جائے" معروف جب اپنے نفس پر عتاب کرتے تھے تو اس سے کہتے تھے کہ اے مسکین! "تو کب تک روتا رہے گا اور آہ سرد بھرتا رہے گا؟ شیوۂ اخلاص اختیار کر تاکہ دوزخ سے رہائی پائے" کسی نے معروف سے پوچھا کہ اولیاء کی علامت (پہچان) کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا "اولیاء کی علامات تین ہیں (۱) ان کی پریشانیاں صرف اللہ ہی کے لئے ہوتی ہیں (۲) وہ اللہ ہی پر مشغول رہتے ہیں (۳) اللہ ہی کی طرف دوڑتے ہیں" کسی نے ان سے پوچھا کہ دنیا کی محبت دل سے کس طرح نکل سکتی ہے؟ انہوں نے جواب دیا "اللہ کی محبت کی صفا سے اور حسن معاملت سے" انہوں نے ۲۰۰ھ میں وفات پائی۔

(۱۵) ابو سلیمان دارانیؒ ——— م ۲۱۵ھ

ان کا نام عبد الرحمٰن بن عطیۃ العنسی ہے۔ دمشق کے نزدیک موضع داران میں پیدا ہوئے۔ یہیں وفات پائی۔ احمد بن ابی الحواری کے مرشد اور استاد تھے۔ ذیل میں ان کے چند اقوال درج کئے جاتے ہیں جو طبقات الصوفیہ سے ماخوذ ہیں۔ واضح ہو کہ عطار، امام شعرانی اور جامی نے اسی کتاب کو سامنے رکھ کر اپنی کتابیں مرتب کی ہیں:۔

(۱) جو دنیا سے کشتی لڑا، دنیا نے اسے پچھاڑ دیا۔

(۲) جب دنیا کسی کے دل میں گھر بنا لیتی ہے تو آخرت اس دل سے رخصت ہو جاتی ہے۔

(۳) جب تم دنیا اور آخرت کی کوئی حاجت چاہو تو بھوک کو اپنے اوپر لازم کر لو۔ اس کے بعد اپنی حاجت طلب کرو۔

(۴) ہر وہ بات جو تجھے خدا سے غافل کر دے تیرے حق میں شوم (منحوس) ہے اور ہر سانس جو بغیر یاد حق تجھ سے باہر نکلے وہ تیری ہستی پر داغ ہے۔

(۵) ہر وہ عمل جس پر تجھے دنیا میں ثواب نہ ملے۔ آخرت میں بھی اس کی جزا نہیں ملے گی۔

(۶) جب تیرا قلب بھوکا اور پیاسا ہوگا تو اس میں صفا اور رقت پیدا ہوگی اور جب تو شکم سیر ہوگا اور سیراب ہوگا تو تیرا قلب اندھا ہو جائے گا۔

(۷) زاہد کا آخری قدم، متوکل کا پہلا قدم (درجہ) ہوتا ہے۔

(۸) ہر شے کا مہر (معاوضہ) ہوتا ہے اور جنت کا مہر، ترک دنیا ہے۔

(۹) نفس کی خواہش کے خلاف کرنا بہترین عمل ہے۔

(۱۰) ہر شے کے لئے ایک سچائی (صدق) ہے اور یقین کا صدق، اللہ کا خوف ہے۔ یعنی سچے معنی میں وہی شخص اللہ پر یقین رکھتا ہے جس کے دل میں اللہ کی ناخوشی کا خوف جاگزیں ہو۔ انہوں نے ۲۱۵ھ میں وفات پائی۔

(۱۶) احمد ابن عاصم الانطاکی ——— م ۲۲۰ھ

ان کی کنیت ابو عبد اللہ ہے۔ بشر حافی، سری سقطی اور حارث محاسبی کے دوستوں میں سے تھے۔ احمد ابن ابی الحواری کے مرشد تھے ۱۴۰ھ میں بمقام واسط (عراق) پیدا ہوئے تھے اور جوانی میں انطاکیہ چلے گئے جہاں ایک مدت تک عبادات میں مشغول رہے اسی لئے انطاکی مشہور ہوئے۔ آخر عمر میں دمشق میں آگئے تھے۔ اور یہیں ۲۲۰ھ میں وفات پائی۔

انہوں نے زہد و تصوف پر کئی کتابیں لکھی تھیں۔ چونکہ وہ نیت کی پاکیزگی پر بہت زور دیتے تھے۔ اس لئے

کافیہ میں "جاسوس القلوب" کے لقب سے مشہور تھے۔ ان کے چند اقوال ذیل میں درج کئے جاتے ہیں :۔

(۱) حرص و طمع سے بچو اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ قناعت اختیار کرو۔

(۲) طولِ امل سے اجتناب کرو اور توکل کے ذریعے سے اطمینان قلب حاصل کرلو۔

(۳) بوقت خاموشی گفتگو کرنا اور بوقت گفتگو خاموش رہنا انسان کے حق میں بہت مضر ہے۔

(۴) اللہ کا قرب چاہتے ہو تو مخفی گناہوں کو ترک کردو۔

(۵) خدا سے محبت کی علامت یہ ہے کہ سالک اپنا زیادہ وقت مسلسل مراقبات میں بسر کرے، خلوت اختیار کرے اور خاموشی کو شعارِ زندگی بنائے۔

(۶) اس طرح عمل کرو گویا دنیا میں تمہارے علاوہ اور کوئی موجود نہیں ہے۔ اور آسمان میں اللہ کے سوا کوئی اور ہستی موجود نہیں ہے۔

(۱۷) بشر حافی ——— م ۲۲۷ھ

ان کا پورا نام اَبُو نصر بشر بن الحارث بن عبد الرحمٰن حافی ہے۔ مرو کے قریب ایک موضع میں پیدا ہوئے تھے۔ جوانی میں بغداد آ گئے اور یہیں ۲۲۷ھ میں وفات پائی۔ امام احمد ابن حنبلؒ کے ہمعصر اور مداح تھے۔ چنانچہ اپنے مریدوں سے کہا کرتے تھے "احمد حنبل در مقام پیغمبران ایستادہ است" فضیل ابن عیاضؒ کے ہم نشیں تھے۔ ذیل میں ان کے چند اقوال درج کرتا ہوں :۔

(۱) تو اس وقت تک مردِ کامل نہیں کہلا سکتا جب تک تیرا دشمن تیری طرف سے مامون و محفوظ نہ ہو جائے۔ اے مسلمان! تو کس طرح صاحبِ خیر ہو سکتا ہے جب کہ تیرے دوست احباب بھی تیری طرف سے مامون نہیں ہیں؟

(۲) تجھے اس وقت تک عبادت میں کوئی لذت یا حلاوت نصیب نہیں ہو سکتی جب تک تیرے اور تیری خواہشات نفس کے درمیان لوہے کی دیوار حائل نہ ہو جائے۔

(۳) احمق کی طرف دیکھنے سے آنکھ سوختہ ہو جاتی ہے اور بخیل کی طرف دیکھنے سے دل پتھر ہو جاتا ہے (پس دونوں سے بچو)

(۴) اگر تو اس دنیا میں عافیت اور سلامتی کا طالب ہے تو (۱) حدیث نبویؐ بیان مت کر (۲) کسی کی گواہی مت دے (۳) کسی مسجد میں امامت مت کر (۴) کسی کے گھر دعوت کھانے مت جا۔

ایک شخص نے ان سے کہا "مجھے رسول اللہؐ کی کوئی حدیث سنائیے۔ انہوں نے حسب دستور انکار کیا اس نے ہر چند اصرار کیا۔ مگر وہ اپنے انکار پر قائم رہے۔ مجبور ہو کر اس نے کہا "اے بشر! میں یقیناً قیامت کے دن خدا سے تیری شکایت کروں گا کہ تو نے عالم دین ہونے کے باوجود مجھے آنحضرت صلعم کی کوئی حدیث

نہیں سنائی" انہوں نے جواب دیا "میں اللہ تعالیٰ سے عرض کروں گا کہ اے اللہ! تو نے مجھے نفسِ امّارہ کی مخالفت کا حکم دیا تھا۔ میرا نفس احادیث نبوی بیان کرنے اور منبر پر بیٹھ کر ان کی شرح کرنے کو بہت چاہتا تھا۔ تا کہ عوام مجھے محدث اور امام کہہ کر خطاب کریں (اور اس طرح نفس خوش ہو) اور رفتہ رفتہ مجھے اپنے مذہبی پیشوا اور دینی سردار بنا لیں (اور اس طرح نفس کو جاہ و اقتدار حاصل ہو جائے) پس اے خدا میں نے ان دونوں باتوں میں اس کی مخالفت کی اور کسی کو نہ منبر پر بیٹھ کر حدیث سنائی اور نہ مسند پر بیٹھ کر اس کا درس دیا"

وفات کے وقت انہوں نے اللہ کی بارگاہ میں یوں التجا کی :۔

"اے اللہ! تو نے اپنے فضل و کرم سے مجھے دنیا میں وہ عزت عطا کی جس کا میں ہرگز مستحق نہ تھا اس لئے اب تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ اپنے فضل و کرم سے قیامت کے دن مجھے رسوا مت کیجو"

(۱۸) احمد بن ابی الحواری ——— م ۲۳۰ھ

ان کا نام میمون ہے، ابو الحواری اور ابو الحسن کنیت ہے۔ وطن دمشق تھا۔ ابو سلیمان دارانی سے فیض حاصل کیا۔ حضرت جنید کہا کرتے تھے کہ احمد ابن ابی الحواری ملک شام کے گلِ ریحان ہیں۔ ان کا پورا خاندان زہد و تقویٰ کے لئے مشہور تھا۔ چند اقوال ذیل میں درج کرتا ہوں :۔

(۱) یہ دنیا مزبلہ اور کتوں کا مجمع ہے اور وہ انسان کتے سے بھی بدتر ہے جو اس دنیا سے قطع تعلق نہیں کرتا اور اس کے لئے اپنے بھائیوں اور دوستوں سے لڑتا ہے۔ کیونکہ کتا تو شکم سیر ہونے کے بعد چلا جاتا ہے مگر یہ لوگ شکم سیر ہو جانے کے باوجود دنیا سے منہ نہیں موڑتے بلکہ ہر لحظہ اسی میں مشغول اور منہمک رہتے ہیں۔

(۲) جو شخص اس دنیا کو محبت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اللہ اس کے قلب سے زہد اور نورِ یقین خارج کر دیتا ہے۔

(۳) بہترین گریہ وزاری یہ ہے کہ انسان اپنے وقت عزیز کے فوت (ضائع) ہو جانے پر آہ و بکا کرے۔

(۴) جو عمل اتباع سنت کے بغیر ہو وہ عمل باطل ہے۔

(۵) اللہ سے محبت کی علامت اس کی اطاعت ہے۔ اور کوئی شخص اللہ سے محبت نہیں کر سکتا جب تک خود اللہ ابتداء نہ کرے[1]

(۶) جسے اپنے نفس کی معرفت حاصل نہ ہو اس کا دعویٰ دینداری محض فریبِ نفس ہے۔ انہوں نے ۲۳۰ھ میں وفات پائی۔

---

[1] راقم الحروف کا عقیدہ بھی یہی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ محبت کے لئے جان پہچان (معرفت) شرط ہے اور کوئی شخص اللہ کو نہ جان سکتا ہے نہ پہچان سکتا ہے ۱۲

(۱۹) حاتم الاصم م ۲۳۷ھ

ان کا نام حاتم بن عنوان بن یوسف الاصم ہے۔ ابو عبد الرحمٰن کنیت ہے۔ خراسان کے قدیم مشائخ میں سے ہیں۔ شقیق بلخی کے مرید اور احمد بن خضرویہ کے مرشد ہیں۔ یہ دراصل اصم (بہرا آدمی) نہیں تھے۔ اس لقب کی وجہ یہ ہے کہ ایک دن ایک ضعیفہ ان سے کوئی مسئلہ پوچھ رہی تھی کہ اثنائے گفتگو میں اس کی ہوا (ریح) خارج ہو گئی انہوں نے اس خیال سے کہ اسے خجالت نہ ہو۔ فوراً اس سے کہا کہ میں اونچا سنتا ہوں۔ اس لئے بلند آواز سے گفتگو کرے۔ بس اس دن سے اصم مشہور ہو گئے۔

ایک شخص نے ان سے نصیحت طلب کی۔ انہوں نے جواب دیا "اذا اردت ان تعصی مولاک فاعصہ فی موضع لا یراک" جب تو کسی گناہ کا ارادہ کرے تو اس جگہ جا کر گناہ کیجو جہاں تیرا آقا تجھے نہ دیکھ سکے۔

ان کا قول ہے کہ جو شخص سلوک طے کرنے کا ارادہ کرے تو اسے لازم ہے کہ پہلے چار اموات اپنے اوپر وارد کرے (۱) موت ابیض یعنی گرسنگی (۲) موت اسود یعنی لوگوں کی ایذا پر صبر (۳) موت احمر یعنی مخالفتِ نفس (۴) موت اخضر یعنی پیوند لگا ہوا لباس۔ ان چار باتوں کو اختیار کر لینے کے بعد سلوک طے کرنا آسان ہو جائے گا۔

ان کا قول ہے کہ میرے مرشد نے مجھ سے کہا کہ اگر کوئی شخص دو سو سال تک زندہ رہے مگر ان چار باتوں کا علم حاصل نہ کرے تو دوزخ کے عذاب سے رہائی نہیں پا سکتا (۱) پہلی بات اللہ کی معرفت ہے (۲) اپنی ذات کی معرفت (۳) اللہ کے اوامر اور نواہی کا علم (۴) اپنے اور اللہ کے دشمن کی معرفت۔

ان کا قول ہے کہ عجلت (جلدی کرنا) شیطان کا کام ہے سوائے ان پانچ باتوں کے (۱) مہمان کو کھلانا (۲) مُردے کی تجہیز (۳) کنواری لڑکی کا نکاح جب وہ جوان ہو جائے (۴) قرض ادا کرنا جب واجب ہو جائے (۵) توبہ کرنا جب کوئی گناہ سرزد ہو جائے۔ (ان پانچ باتوں میں جلدی کرنا مستحسن ہے)

نیز یہ کہ طاعت کی اصل تین چیزیں ہیں (۱) خوف (۲) رجاء (۳) حبّ۔

اور معصیت کی اصل بھی تین چیزیں ہیں (۱) کبر (۲) حرص (۳) حسد۔

نیز یہ کہ قلب کی پانچ قسمیں ہیں (۱) قلبِ مردہ (۲) قلبِ مریض (۳) قلبِ غافل (۴) قلبِ متنبہ (۵) قلبِ صحیح و سالم (قلبِ سلیم)

نیز یہ کہ (۱) جس نے ورع اختیار کئے بغیر اللہ کی محبت کا دعویٰ کیا وہ بھی جھوٹا ہے۔

(۲) جس نے انفاق مال کے بغیر جنت کی محبت کا دعویٰ کیا وہ بھی جھوٹا ہے اور (۳) جس نے محبتِ فقر کے

بغیر حبِ رسول کا دعویٰ کیا وہ بھی جھوٹا ہے۔

نیز یہ کہ جہاد کی تین قسمیں ہیں (۱) جہاد فی السّر یعنی شیطان سے جنگ یہاں تک کہ وہ مغلوب ہو جائے۔ (۲) جہاد فی العلانیہ یعنی فرائض کو بخوبی ادا کرنا (۳) جہاد مع اعداء اللہ یعنی اللہ کے دشمنوں سے قتال۔

نیز یہ کہ اللہ کی رضا چار باتوں پر موقوف ہے:۔ یقین، توکل، اخلاص اور معرفت۔

ایک دن حاتم اور ان کے مرشد شقیق کے درمیان یہ گفتگو ہوئی:۔

شقیق: تم کتنی مدت سے میرے پاس ہو اور اس عرصے میں کیا سیکھا؟

حاتم:۔ میں ۳۳ سال سے آپ کے پاس ہوں اور اس عرصے میں آٹھ باتیں آپ سے سیکھیں۔

شقیق:۔ سناؤ وہ کون کون سی باتیں ہیں:۔

حاتم:۔ پہلی بات یہ کہ میں نے دیکھا کہ دنیا میں ہر شخص کسی نہ کسی محبوب پر فریفتہ ہے۔ لیکن اس محبت کا انجام یہ ہوتا ہے کہ جب چاہنے والا مر گیا تو محبوب نے اسے چھوڑ دیا۔ یہ دیکھ کر میں نے فیصلہ کر لیا کہ نیکیوں کو اپنا محبوب بناؤں تاکہ جب مروں تو بھی وہ میرے ساتھ رہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ میں نے اس آیت پر غور کیا " واما من خاف مقام ربہ ونھی النفس عن الھویٰ فان الجنۃ ھی الماویٰ " اور جو شخص اپنے رب کے سامنے پیش ہونے سے ڈرا۔ اور جس نے اپنے نفس کو خواہشات نفسانی سے روکا تو اس کا ٹھکانا جنت ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اصل مقصود اللہ کی ذات ہے لہٰذا میں نے نفسانی خواہشات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ یہاں تک کہ میرا دل طاعتِ رب پر آمادہ ہو گیا۔

تیسری بات:۔ میں نے دنیا کے ساز و سامان کا اس زاویہ نگاہ سے جائزہ لیا کہ یہاں جو کچھ بھی ہے۔ اس کی بہر حال کچھ مقدار اور قیمت ہے۔ پھر اس حقیقت پر نظر پڑی " ما عندکم ینفد وما عند اللہ باق۔ جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ ہمیشہ باقی رہے گا۔

اس سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ان تمام اشیا کی قدر و قیمت کو ہمیشہ باقی رکھنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ان کا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف پھیر دیا جائے۔

چوتھی بات:۔ جب میں نے یہ غور کیا کہ لوگ مجد و شرف کے کن کن معیاروں کو سامنے رکھتے ہیں تو میں نے دیکھا کہ کوئی تو مال کی کثرت پر نازاں ہے اور کوئی اپنے نسب پر فخر کرتا ہے لیکن اصل معیار کچھ اور ہی ہے۔

ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم اللہ کی نگاہ میں وہی اکرم ہے جو اتقیٰ ہے۔

پس میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر بزرگی کی آرزو ہے تو تقویٰ اختیار کرنا چاہیئے۔

پانچویں بات :- جب میں نے لوگوں کی اس کمزوری پر غور کیا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کو بُرائیوں کہتے ہیں تو معلوم ہوا کہ اس کا باعث حسد ہے اس لئے اس مرض سے نجات پانے کی فکر کی اور حسد کو دل سے نکال دیا۔

چھٹی بات :- جب میں نے دنیا میں جدال و قتال کے اسباب پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ اس کا باعث حصولِ رزق و مال ہے۔ شیطان ایک کو دوسرے کے خلاف ابھارتا رہتا ہے اور تم دوسروں کو زیر کرو۔ اور مال و دولت، رزق و ثروت کے اعتبار سے ان سب سے بڑھ جاؤ۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے نصیحت فرمائی ہے۔ "ان الشیطان عدوٌ فاتخذوہ عدوّا" بے شک شیطان تمہارا دشمن ہے اس لئے اسے اپنا دشمن ہی قرار دو پس میں نے قرآن کی اس نصیحت پر عمل کیا اور شیطان کی ترغیب سے محفوظ ہو گیا۔

ساتویں بات :- میں نے اس حقیقت کا بھی مشاہدہ کیا کہ اہلِ دنیا روٹی کے لئے کس قدر ذلتیں برداشت کرتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ حرام و حلال میں بھی تمیز نہیں کرتے۔ حالانکہ قرآن صاف لفظوں میں یہ اعلان کرتا ہے کہ : "وما من دابۃٍ فی الارض الا علی اللہ رزقھا" اور زمین پر کوئی چلنے پھرنے والا ایسا نہیں ہے جس کے رزق کا ذمہ اللہ نے نہ لیا ہو۔ اس لئے میں نے حصولِ رزق کے جنون کو دماغ سے نکال دیا اور خلوص کے ساتھ اللہ کی عبادت و اطاعت میں مشغول ہو گیا۔

آٹھویں بات :- جب میں نے لوگوں کی حالت پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی شے سے آس لگائے ہوئے ہے اور کسی نہ کسی فانی مخلوق پر تکیہ کئے ہوتے ہے۔ کسی کو مال تجارت پر بھروسہ ہے، کسی کو جائداد پر۔ کسی کو باغات پر، کسی کو اپنے ہنر یا فن پر۔ کسی کو اپنی جسمانی طاقت پر وغیرہ ذلک۔ جب غور کیا تو معلوم ہوا کہ یہ سارے سہارے اور توقعات غلط ہیں۔ کیوں نہ اللہ پر بھروسہ کروں جبکہ وہ خود فرماتا ہے "ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ" اور جو اللہ پر بھروسہ کرتا ہے تو اللہ اسے کافی ہے۔

جب شقیق بلخی نے اپنے مرید حاتم الاصم کی یہ تقریرِ دلپذیر سنی تو بے اختیار تحسین و آفرین کی۔ اور فرمایا "بے شک یہی وہ آٹھ بنیادی عقائد ہیں جو دین اسلام کے لئے بمنزلہ محور و مرکز ہیں تم بالکل ٹھیک سمجھے"۔ حاتم الاصم نے ۲۳۷ھ میں وفات پائی۔

النبی الخاتم مؤلفہ سید مناظر احسن گیلانی مرحوم

سائز ۱۸×۲۲/۸ ۱۳۸ صفحات۔ کاغذ سفید۔ طباعت آفسیٹ۔ قیمت ساڑھے چار روپے

ملنے کا پتہ :-

دارالاشاعت الاسلامیہ، کوثر روڈ، اسلام پورہ، لاہور

واردات و کیفیات

مولوی برکات احمد خاں ٹونکی

مقامِ حیرت

تعارف : از قلم پروفیسر یوسف سلیم چشتی

یہ خط جسے برادرم اسرار احمد سلمہٗ ربہٗ میرے ایماء سے درج میثاق کر رہے ہیں۔ مخدومی و مکرمی مولوی برکات احمد صاحب نے انہیں لکھا تھا۔ مولوی صاحب موصوف نے مولانا حکیم سید برکات احمد صاحب ٹونکی مرحوم و مغفور کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر کے معقول اور منقول دونوں میں دستگاہِ وافی پیدا کی۔

حکیم صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانے (۱۹۰۰ء تا ۱۹۲۸ء) میں منطق فلسفہ اور الٰہیات کے امام تھے اور مولانا عبدالحق خیرآبادی کے جانشین تھے۔ جو خاتم الحکما والمناطقہ امام الاحرار مولانا فضل حق خیرآبادیؒ کے فرزند اور جانشین تھے۔

اللہ تعالیٰ نے مولوی صاحب کو علم ظاہری کے علاوہ سوز باطنی کی دولت سے بھی نوازا ہے۔ جس کی ایک جھلک اس خط سے ہویدا ہو رہی ہے اسی لئے میں نے اس کی اشاعت مناسب سمجھی کہ اقبالؒ نے اپنی غیر معروف کتاب "اسلام میں مذہبی فکر کی تشکیل جدید" میں مشاہدہ باطنی کی واقعیت پر جو کچھ لکھا ہے اس کی تصدیق ہو جائے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ مولوی صاحب موصوف نے خط کا "نصف بہتر" اس زبان میں لکھا ہے جو میری آنکھوں دیکھتے مسلمانوں کی ثقافتی زندگی سے خارج ہو گئی۔ آج سے ۶۸ سال پہلے راقم الحروف کی تعلیم کا آغاز اسی زبان کی تحصیل سے ہوا تھا اور جب فارسی کی ۸، ۱۰ کتابیں پڑھ چکنے کے بعد گلستان شروع ہوئی تھی تو والدہ مرحومہ نے مسجد میں اللہ میاں کا طاق بھروایا تھا اور والد مرحوم نے اپنے تمام احباب کی ضیافت کا اہتمام کیا تھا اور جب استاد محترم (منشی محمد اسحٰق صاحب مرحوم بجنوری) کے حکم سے اس عاجز نے گلستان کا پہلا جملہ پڑھا کہ

"منت خدائے را عزّ و جلّ کہ طاعتش موجب قربت است الخ"

تو والد مرحوم کی استدعا پر منشی صاحب مرحوم نے اس جملے کی شرح کی تھی، جسے جملہ حاضرین نے بہت توجہ سے

ساقیا ع آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

انقلاب روزگار دیدنی ہے کہ آج نہ گلستاں ہے نہ بوستاں۔ نہ ان کے پڑھانے والے نہ پڑھنے والے۔ سمجھنے اور سمجھانے کا تو تذکرہ ہی فضول ہے۔ جب خدا ہی معرض شک میں آچکا ہو تو "طاعت" اور "قرب" یہ دونوں لفظ خود بخود بے معنی ہوگئے۔

آسماں کو تو غلط ثابت کیا سائنس نے
عرش باقی تھا سو وہ بھی حیز شک میں آگیا (اکبر)

مولوی صاحب کی فارسی عبارت پڑھ کر میں نے یہ محسوس کیا (صرف چند لمحات کے لئے) کہ میں ۱۹۰۵ء میں سانس لے رہا ہوں۔

مولوی صاحب نے اسرار احمد سلمہٗ کو لکھا ہے کہ چشتی صاحب سے پوچھو کہ یہ حسرت موہانی، کیا صاحبِ واردات تھے؟ اس کا جواب میثاق میں شائع کرنے میں مصلحت یہ ہے کہ مولوی صاحب ــــــ کے علاوہ دوسروں کو بھی یہ معلوم ہو جائے کہ واقعی مولانا فضل الحسنؒ حسرت موہانی مرحوم صاحبِ نسبت اور صاحب واردات تھے۔ چونکہ میں ان سے ذاتی طور پر واقف ہوں اس لئے بوثوق تمام یہ شہادت دے رہا ہوں اس کا علم مجھے اس وقت ہوا تھا جب میں مارچ ۱۹۲۶ء میں ان کے الیکشن کے سلسلے میں کانپور گیا تھا[2] (یوسف سلیم چشتی)

حمد و ستائش باد مرآں قادر و توانا را کہ خالق و دارندۂ جہاں است و دانندۂ آشکار و نہاں۔ مالکُ الملکِ یُحیی و یُمیت۔ و بعلمہٖ و قدرتہٖ علیٰ کلِّ شیءٍ محیط۔ کلَّ یومٍ ھو فی شأنٍ باایں ہمہ الآن کما کان۔ سبحان ذوالملک والملکوت۔ صاحب العظمۃ والجبروت القائم بذاتہٖ و صفاتہٖ القیوم بعظمتہٖ و کبریائیہٖ۔ ہر صبح و شام بر در کبریائیش صور عظمت می دمند۔ و کس لمن الملک می گویند۔ شنوندگان می شنوند و سرافگندہ بزبان و دل اعتراف کبریائیٔ او می نمایند۔ کراست یارائے تملک ملک و سلطانی دم زند۔ صدائے للّٰہ الواحد القہّار باز می آید۔

۱؎ میں نے ان کا نام قصداً لکھا ہے کیونکہ انہیں احباب سے یہ دوستانہ شکوہ تھا کہ

جب سے کیا عشق نے حسرت مجھے
کوئی بھی کہتا نہیں فضل الحسن

۲؎ مرحوم سے میری نیاز مندی کا آغاز ۱۹۱۶ء سے ہوا تھا جب میں نے پہلی مرتبہ ان کا دیوان پڑھا تھا۔ وہ غزل گو شعرائے امام تو تھے ہی، حریت پسندوں کی جماعت میں بھی صفِ اول میں تھے۔ اگر فرصت نصیب ہوئی تو ان کے بارے میں ایک مفصل مضمون لکھوں گا۔

سرِ بادشاہان گردن فراز
بدرگاہ او بر زمین نیاز

ایں نفخ صور اصغر است کہ ہر شبانہ روز بآں احیاء اماتت باشد نفخ صور اعظم روز قیامت خواہد بود۔ از صور اول اماتت کلی کہ عبارت از فنائی محض است رو خواہد داد و از صور دوم احیائی کلی و دائمی خواہد بود پاس دو نفخات ہم۔ لمن الملک الیوم خواہند گفت۔ للّٰہ در من قال

أینَ الملوکُ العالیہ
ترکوا بناءً خالیہ
ہلکوا مع السلطنیۃ
واللّٰہ باقٍ بالقِدَم

نفخ صور اصغر از برائے ایں ست کہ ہر صبح و شام کبریائی خود را آشکار کنند تا کسے کبر و عظمت را بخود جا ندہد۔ زیرا کہ از ما بندگی می خواہد و کبر با بندگی در نسازد۔

بہیچ کس در ملک او انباز نے
قول او را لحن نے آواز نے

درود بر خاتم الانبیاء محمد بن عبداللہ المصطفیٰ و بر جمیع پیروان او کہ لواء رسالتش را محکم گرفتہ در قیام حکومت الٰہیہ کہ مراد از شریعت محمدیہ است سعی نمودہ اند و الحال می نمایند و بر اصحاب وے کہ سرگفت بہ تکمیل کار رسالت بر آر۔ علم نبوت را سربلند کردند۔ امابعد۔ اے برادر سلامتی باد بر شما و بر کسانیکہ بشما رفاقت بے غرضانہ دارند۔ در سایۂ عرش پناہ گرفتہ و مورد عنایات الٰہی باشند۔ امید دارم کہ من ہم یکے از آنہا باشم۔

اے برادر چہ گویم و چہ طور گویم کہ در ہفتۂ گزشتہ بر سر ایں بندۂ ناتواں کہ چیزے بہ توانائی خود دم می زد چہ گزشت۔ دل زبان ندارد و زبان ترجمانی دل را نشاید۔ ولی چہ کنم اگر گویم زبان سوزد۔ و اگر دم در کشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد۔

بشنو از من چوں حکایت میکنم
بے زبانی را شکایت می کنم
کز جلالش تا مرا بشمردہ اند
ہیبت سطوت بہ دل افگندہ اند
سینۂ گشتہ شرحہ شرحہ زاں الم
کے توانم کرد شرح آں رقم
سینۂ خامہ چو من ترشیدہ اند
ہم زبانش را چو من ببریدہ اند
کیست کو شنود بغیر از حرف و صوت
مستنداں را شود یاور و دوست

عزیزم گاہ گاہے کسی ادنیٰ سبب سے وجد و مستی یا رقت و خشوع کی کیفیات پیدا ہو جاتی تھیں۔ چونکہ میری فطرت کے مطابق ہوتی تھیں اس لئے کئی کئی روز تک اس کے اثرات باقی رہتے تھے۔ گزشتہ ہفتہ ایک ایسی حالت کا معائنہ ہوا کہ تا ایں دم اضطراب باقی ہے۔ تقریباً تین بجے دن کو چارپائی پہ لیٹا ہوا شعرا کی منتخب غزلیات پڑھ رہا تھا۔ حضرت موہانی کی غزل شروع کی جس کا مطلع ہے سہ

ستم ہو جائے تمہید کرم ایسا بھی ہوتا ہے
محبت میں بتا اے ضبط غم ایسا بھی ہوتا ہے

دوسرا شعر یہ تھا ؎

فنا دیتی ہیں سب رنج و الم حیرانیاں میری
تری تسکین بیجہ کی قسم ایسا بھی ہوتا ہے

حیرانی سے مراد مقام حیرت ہے۔ جو بے کیف و کم ناقابل بیان ہے ہر قسم کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ اس مصرعہ سے یہی کیفیت مجھ پر طاری ہوئی لیکن جلد ہی حالت بالکل بدل گئی۔ تسکین بیجہ نے عظمت و جلال الٰہی کا تصور پیدا کیا۔ بڑے بڑے پہاڑ سامنے آئے بعد ازاں یکدم رات کی تاریکی چھا گئی۔ طوفانی سمندروں میں کوہ پیکر لہریں اٹھ رہی تھیں۔ یک دم خوف و دہشت طاری ہو گئی۔ آنکھیں بند نہیں ہوتی تھیں۔ کچھ دیر یہ منظر دکھائی دیا اب اس سے بھی سخت مرحلہ تھا۔ میں نے خود کو فضا میں موجود پایا۔ صبح صادق کی سی بہت مدھم روشنی تھی لا تعداد عظیم کرّے ادھر ادھر گھوم رہے تھے اس عالم تنہائی میں یہ خوفناک منظر ناقابل برداشت ہو گیا۔ میں گم کم خاموش دیکھ رہا تھا بالکل صاف و ظاہر یہ کرّے ایک دوسرے کے قریب سے گھوم رہے تھے اگرچہ یہ سب کچھ چند لمحوں میں ہوا لیکن وقت طویل ہو گیا تھا اور ان مناظر کے دیکھنے میں زیادہ وقت محسوس ہوا۔ جب یہ سب مناظر نظروں سے غائب ہوئے تو ناقابل برداشت خوف طاری تھا۔ سانس پھول گیا۔ زبان سے یا رحمٰن یا رحیم پڑھ رہا تھا لیکن معنی یاد نہ آتے تھے۔ جب خوف کم نہ ہوا اور دم گھٹنے لگا تو گھر سے نکل کر خلیل کی طرف بھاگا کسی طرح سکون نہیں ملتا تھا۔ بڑی مشکل سے شام تک حالت سنبھلی دو تین روز تک خوف غالب رہا۔ اب وہ حالت تو نہیں ہے البتہ یہ خیال ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ اگر دوبارہ ایسی یا اس جیسی کوئی حالت پیش آئی تو حرکت قلب بند ہو جائے گی۔ اس واقعہ نے دماغی اور جسمانی اعضا کو بہت متاثر کیا ہے۔ خود میں بہت کمزوری محسوس کر رہا ہوں۔ عزیزم شرعی طور پر تمہاری گواہی اس دنیا میں قابل قبول ہے تو آخرت میں بھی قابل قبول ہو گی۔ آپ گواہ رہیں دل و زبان سے میرا اقرار ہے۔ آمنتُ باللہِ ربّاً و بالاسلام دیناً و بمحمّدٍ نبیّاً۔ ربِّ لا تذرنی فرداً و انت خیر الوارثین۔ لا الٰہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین۔

پرتو قہر میتلی کہ عقابی باشم
مشعل حسن بفروز کہ پروانہ شوم

طاقتم نیست کہ بینم بہ جلال و جبروت
کرم و لطف بفرمائی کہ مستانہ شوم

نسبت موسوم نیست کہ مدہوش کنی
نسبت اکرام بخشش کہ فرزانہ شوم

ہوش و مستی بہم آمیخت بہ صہبائی مجاز
فرصتم بخشش کہ فرزانہ و دیوانہ شوم

عزیزم کچھ سمجھ میں نہیں آتا ازیں بندۂ ناتواں درجناب قدوس چہ بے ادبی صادر شد کہ بہ پاداش آں تہدید و ترہیب کردہ اند۔ آمنت بعظمتہ و کبریائہ انا موجود ببقائہ و ارادتہ لیس لی وجودٌ و ارادۃٌ ہو الموجود والمرید فعّالٌ لما یرید۔

محترم چشتی صاحب سے پوچھیں کہ یہ حسرت صاحب' صاحب واردات تھے جس کے اثرات مجھ پر پڑے۔ مجھے تو حسرت نام سے گھبراہٹ ہوتی ہے۔ سراپا یاس و قنوطیت ہیں رجائی انسان ہوں۔ لا تقنطوا من رحمۃ اللہ کے یقین سے زندہ ہوں اور یہی یقین آخرت میں لے کر جاؤں گا اور منہ مانگی اور من بھاتی مراد پاؤں گا۔ " احقر: برکات احمد عفی عنہ"

شکور حسین یاد۔ ایم اے
لیکچرار اردو، گورنمنٹ کالج، لاہور

خدمتِ خلق

ماہ اکتوبر کے میثاق میں پروفیسر یوسف سلیم چشتی کا جو مضمون "تاریخ اسلام میں صوفیائے کرام کا مقام" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اس میں "تصوف کے ارکانِ سہ گانہ" میں سے ایک "خدمت خلق" کو بھی شمار کیا گیا تھا جس کے ضمن میں شیخ سعدیؒ کا یہ شعر بھی ہدیۂ قارئین کیا گیا تھا کہ ؎

طریقت بجز خدمت خلق نیست
بتسبیح و سجادہ و دلق نیست

بھائی شکور صاحب کی مندرجہ ذیل نظم اسی کی شرح ہے ——— (اسرار احمد)

خدمتِ خلق سے حاصل وہ خوشی ہوتی ہے
تا ابد قلب کو رکھتی ہے جو شاداب و جواں
عمر بھر جس سے مہکتا ہے شبستانِ وجود
جس کی خوشبو سے معطر ہے فضائے دوجہاں

خدمتِ خلق سے حاصل وہ خوشی ہوتی ہے
ظلمتِ یاس و غم و درد سے رکھتی ہے جو دُور
زیست کو بخشتی رہتی ہے جو تنویر، مدام

روح کو جس کے اُجالوں میں اماں ملتی ہے
جانِ بے تاب کو دیتی ہے جو صحت بھرا جام
خدمتِ خلق سے حاصل وہ خوشی ہوتی ہے

جاوداں کیف ہے جس کا، ابدی سرور
جس کی تعبیریں درخشندہ ہیں تابندہ ہیں
گیت ہیں جس کے دھڑکتی ہے تمنائے ازل
جس کی لَے، جس کی دھنیں زندہ ہیں پائندہ ہیں
خدمتِ خلق سے حاصل وہ خوشی ہوتی ہے

وقت کا ہاتھ مٹا سکتا نہیں جس کے نقوش
موت کا خوف بجھا سکتا نہیں جس کے چراغ
جس سے انسان کو معراج عطا ہوتی ہے
جس سے ملتا ہے محبت کے سویروں کا سراغ
کام آجائے کسی کے کوئی بے منتِ غیر
اِس سے بڑھ کر بھی سعادت کوئی ہو سکتی ہے؟
اِس سے بڑھ کر بھی ہے دنیا میں کوئی دولتِ زیست؟
اِس سے بڑھ کر بھی مسرت کوئی ہو سکتی؟

نادر اور کمیاب

کُتب برائے فروخت

(۱)	تفسیر مراغی (عربی) مکمل ۳۰ حصے، مجلد ۶ جلد	۲۰۰ روپے
(۲)	مقاییس اللغت عربی مکمل ۶ جلد	۱۲۵ روپے
(۳)	فصوص الحکم مع تعلیقات مجلد	۲۰ روپے
(۴)	تفسیر ابن القیم عربی مجلد	۲۰ روپے
(۵)	مجازات القرآن عربی مجلد	۲۵ روپے
(۶)	تفسیر طبری طبع جدید، سفید کاغذ، جلد اوّل و دوم مجلد	۳۰ روپے
(۷)	شرح موطا فارسی از شاہ ولی اللہ مکمل مجلد	۵۰ روپے
(۸)	مکمل لغات القرآن	۱۰ روپے
(۹)	حجۃ اللہ البالغہ عربی مجلد	۲۰ روپے
(۱۰)	اقامۃ الوفا عربی تاریخ خلافت راشدہ مجلد	۱۰ روپے
(۱۱)	الوفا فی سیرۃ المصطفیٰ مؤلفہ ابن جوزی عربی مکمل مجلد	۲۵ روپے
(۱۲)	الترتیب والبیان دو حصے مجلد تفصیل مضامین قرآن	۴۰ روپے
(۱۳)	ریاض الصالحین نووی عربی	۲۰ روپے
(۱۴)	[illegible] عربی	۱۰ روپے
(۱۵)	معجم غریب القرآن	۱۰ روپے
(۱۶)	القرآن والفلسفہ عربی	۱۰ روپے
(۱۷)	التصوف الاسلامی عربی	۱۰ روپے
(۱۸)	فصل المقال لابن رشد عربی	۱۰ روپے
(۱۹)	اردو ترجمہ شرح وقایہ مکمل مجلد	۲۵ روپے

(۲۰)	شرح مثنوی دفاتر اول دوم سوم مؤلفہ ولی محمد اکبر آبادی نایاب	۵۰ روپے
(۲۱)	نجوم الفرقان مع لغات القرآن عربی انگریزی نایاب	۲۰ روپے
(۲۲)	اساس البلاغۃ زمخشری	۴۰ روپے
(۲۳)	مکاشفات رضوی شرح مشکلات مثنوی	۱۵ روپے
(۲۴)	رسالہ شمسیہ عربی مع ترجمہ انگریزی در منطق نایاب	۱۵ روپے
(۲۵)	تفصیل آیات القرآن	۳۵ روپے
(۲۶)	تفسیر ابن عباس	۱۵ روپے
(۲۷)	المرشد (کلید آیات)	۳۵ روپے
(۲۸)	شرح فصوص الحکم فارسی	۱۵ روپے
(۲۹)	الوار الرحمٰن سوانح شاہ عبدالرحمٰن صاحب نایاب	۱۰ روپے
(۳۰)	حسن البیان فی مفردات القرآن	۱۵ روپے
(۳۱)	زاد المسافرین ناصر خسرو بزبان فارسی	۵۰ روپے

المشتہر

منیجر عشرت پبلشنگ ہاؤس،

ہسپتال روڈ، انارکلی، لاہور

اس شمارے کے ساتھ ایک ضمیمہ مشتمل بر فہرست مضامین شائع شدہ 'میثاق' جلد ۵ (از جنوری تا دسمبر ۱۹۶۸ء) ارسال ہے۔ تاکہ مجلہ فائل رکھنے والے حضرات اس کو اپنے فائل کے شروع میں چسپاں کر سکیں ——

(منیجر)

علوم قرآنی کا بیش بہا خزانہ

مولانا امین احسن اصلاحی

کی تفسیر

تدبّرِ قرآن

جلد اول —— مشتمل بر

مقدمہ وتفاسیر آیۃ بسم اللہ، سورۃ فاتحہ، سورۃ بقرہ و سورۃ آل عمران

سائز ۲۲×۲۹/۸ ، صفحات ۸۸۰

آفسٹ کی دیدہ زیب طباعت

جرمی پشتہ کی مضبوط و پائدار جلد کے ساتھ

ہدیہ ۳۰ روپے

(محصولڈاک: دو روپے تیس پیسے)

(بتیس روپے تیس پیسے بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائیں یا وی پی طلب کریں)

(نمونہ کے صفحات مفت طلب فرمائیں)

اس کے علاوہ

تفسیر آیت بسم اللہ و سورۂ فاتحہ

بڑا سائز - صفحات ۳۶ - ہدیہ ۷۵ پیسے

علیحدہ مطبوعہ بھی موجود ہے بذریعہ ڈاک طلب فرمانے کے لئے ۸۵ پیسے کے ٹکٹ ارسال فرمائیں۔

دار الاشاعت الاسلامیہ

کوثر روڈ، اسلام پورہ (کرشن نگر) لاہور - 1 فون نمبر 69522

(سول ایجنٹ برائے بھارت: کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ — لکھنؤ)